قوموں
کا
عروج وزوال

مولانا سید حامد علی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قوموں کا عروج وزوال

تاریخ قوموں کے عروج وزوال کا ایک عبرتناک مرقع ہے آپ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھیں گے کہ ایک قوم پستی وگمنامی میں پڑی تھی کہ اچانک ابھرنا شروع ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک طاقتور اور فاتح قوم بن جاتی ہے دوسری قومیں اس کی طاقت کا لوہا ماننے لگتی ہیں اس کے اقتدار کے آگے سرخم کرتی ہیں، اور جو اس سے ٹکر لیتی ہیں مُنہ کی کھا کر پسپا ہوتی ہیں، یہ حالت ایک عرصہ تک رہتی ہے، پھر ایک زمانہ آتا ہے کہ وہی قوم زوال سے دوچار ہونے اور سر بلندی سے پستی کی طرف بڑھنے لگتی ہے اس کی طاقت کم ہوجاتی ہے اس کی دھاک دلوں سے اٹھتی جاتی ہے اور ایک دن وہ آتا ہے کہ وہ کسی دوسری قوم کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے، ہزارہا سال سے یہی ہوتا چلا آیا ہے اور آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے یہی تماشا ہو رہا ہے بڑی بڑی صاحبِ جبروت قومیں ہمارے دیکھتے دیکھتے بے طاقت وبے اثر ہو کر رہ گئی ہیں، جرمنی وجاپان کا خاتمہ، اٹلی کا زوال، فرانس کی بے طاقتی اور برطانیہ کی بے چارگی، یہ بالکل حال ہی کے واقعات ہیں اور ان میں سے کون سا واقعہ ہے جو کم حیرت انگیز ہے اور مسلمان قوم تو اس سلسلے کی عبرتناک ترین مثال ہے۔

مسلمان ایک ہزار سال تک دنیا کی فکری وسیاسی قیادت کرنے اور عروج وارتقاء

کے بلند منازل پر پہنچنے کے بعد آج انتہائی پستی اور روز افزوں انحطاط کا شکار ہیں جس قوم کی کل تک دنیا میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی وہ آج ہر چھوٹی بڑی قوم سے ترساں و لرزاں ہے، کل تک جس قوم کی تمام عالم میں ساکھ تھی آج اس کا کوئی وزن نہیں رہا ہے، کل تک نوعِ انسانی جس قوم کے افکار و نظریات کے پیچھے چل رہی تھی آج وہ ہر غلط اور مہمل نظریہ کے پیچھے آنکھ بند کئے دوڑی چلی جا رہی ہے، کل تک جو سب سے زیادہ باعمل قوم تھی اب وہ سب سے زیادہ بے عمل اور ناکارہ قوم ہو کر رہ گئی ہے، سوال یہ ہے کہ سب کچھ اتفاقی ہے یا اس کے پیچھے کچھ اسباب بھی ہیں، قوموں کا ابھرنا اور گرنا کسی ضابطہ اور قانون کے ماتحت ہوتا ہے یا محض بخت و اتفاق کا نتیجہ ہوتا ہے یہ سوال دنیا کا سب سے زیادہ اہم سوال ہے اور اگر ہم نے اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا اور اس کا صحیح اور معقول جواب نہ معلوم کیا تو نوعِ انسانی کی صلاحیتیں یوں ہی ضائع ہوتی رہیں گی، قومیں اسی تلخ اور ہولناک انجام سے دوچار ہوتی رہیں گی اور کسی بھی رو بزوال قوم کا مداوا نہ ہو سکے گا اس سوال کا جواب معلوم کرنا ان قوموں کے لیے بھی اہم ہے جو اس وقت قوت و اقتدار کی مالک ہیں، تاکہ وہ حقیقی اور پائدار اقتدار سے بہرہ مند ہو سکیں، اور ان کی اجتماعی زندگی کی عمارت میں اگر کوئی کجی اور بنیادوں میں کوئی خامی ہو تو اسے دور کر سکیں اور آنے والے برے دنوں سے جن سے آج طاقتور ترین قوم بھی خائف ہے اپنے آپ کو بچا سکیں، اور ان قوموں کے لیے اس مسئلہ کا حل جاننا تو انتہائی ضروری ہے جو رو بزوال ہیں کیوں کہ اس کے بغیر ان کا روز افزوں زوال دور نہیں ہو سکتا، ایسی قوموں کے پاس قوت کا ذخیرہ بہت کم اور زندگی اور عمل کی مدت بہت تھوڑی ہوتی ہے، اگر وہ اس سے فائدہ اٹھانے میں کوتاہی کریں یا قوت کے اس مختصر سے ذخیرہ کو غلط سلط تدبیروں میں اندھا دھند لگا دیں تو اس کے سوا ان کا انجام اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان پر انحطاط کا عمل مکمل ہو جائے، اور وہ تاریخ کا پارینہ ورق بن کر رہ جائیں۔

بخت و اتفاق

بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ قوموں کا عروج و زوال محض بخت و اتفاق کا کرشمہ ہوتا ہے اس میں کسی قوم کی کارگذاریوں کا کوئی دخل نہیں ہوتا جب کسی

قوم کی قسمت بن آتی ہے تو وہ دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی چلی جاتی ہے اور جب اس کی تقدیر بگڑتی ہے تو وہ قدم قدم پر لڑکھڑانے اور اوندھے مُنہ گرنے لگتی ہے ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں کا ستارہ عروج پر تھا اور وہ ہر میدان میں تیزی کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جارہے تھے یہ محض قسمت کی بات تھی ایک زمانہ اب ہے کہ انھیں ہر جگہ ناکامی و نامرادی سے سابقہ پیش آرہا ہے اور یہ بدبختی کے سوا کچھ نہیں ایسے لوگ دن رات تقدیر کا رونا روتے رہتے ہیں اور کچھ کیے دھرے بغیر اس دن کا بڑی شدت سے انتظار کرتے رہتے ہیں جب ان کی قسمت کا ستارہ گردش سے نکلے اور ان کی بگڑی آپ سے آپ بن جائے لیکن کیا یہ خیال صحیح ہے؟ کیا واقعی انسان اپنی قسمت کے ہاتھوں بالکل مجبور ہے؟ کیا انسان کو آزادی فکر و عمل حاصل نہیں ہے؟ کیا انسان اپنے آپ کو بنانے یا بگاڑنے کے سلسلے میں کچھ نہیں کرسکتا؟ کیا اس دنیا میں سب کچھ آپ سے آپ ہوجاتا ہے اور انسان کو کچھ نہیں کرنا پڑتا،؟ کیا انسان کو زندہ رہنے کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کرنا پڑتی، کیا اسے خوراک، لباس اور مکان کے لیے کوئی دوڑ دھوپ نہیں کرنا ہوتی اور کیا انسان اپنے ہر کام کو قسمت کے حوالہ کردیتا ہے اور بغیر کچھ کیے وہ خود بخود تکمیل تک پہنچ جاتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے؟ تو پھر قسمت کا گلہ کیسا؟ ایک انسان کو اگر زندہ رہنے کے لیے کچھ جدّوجہد کرنا پڑتی ہے جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا تو یقیناً ایک قوم کو بھی زندہ رہنے کے لیے اس سے کہیں زیادہ جدوجہد کرنا پڑے گی، اور اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتی اگر کچھ غلط کاریاں ایک فرد کو نقصان پہنچاتی ہیں اور اسے رفتہ رفتہ ذلت، بیماری اور ہلاکت کی طرف لے جاتی ہیں تو یقیناً قوم کو بھی اپنی غلط کاریوں کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے اور وہ بھی غلط کاریوں ہی کی بدولت پستی، زوال اور تباہی سے دوچار ہوتی ہے، جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اس میں ہر چیز قاعدے اور ضابطے میں جکڑی ہوئی ہے، یہاں ہر چیز کی پیدائش، نشو ونما اور ارتقاء اور پھر زوال و فنا کے اسباب و عوامل مقرر ہیں اور سارا کام انھیں کے ماتحت ہوتا ہے، ایک چھوٹے سے ذرے سے لے کر آفتاب تک سب کا یہی حال ہے، پھر انسان اس

قانون سے کیوں مستثنیٰ ہو۔ اور قومیں فنا و بقا کے اسباب وجود میں آئے بغیر کیوں فنا و بقا کے مراحل طے کرنے لگیں؟

مادّی طاقت بعض لوگوں کے نزدیک قوموں کا عروج ان کی مادّی طاقت کا نتیجہ ہوتا ہے اور ان کا زوال ان کی مادّی کمزوری کا پھل، یہ نظریہ آج کل عام طور پر ذہنوں میں بیٹھا ہوا ہے اور مادّہ پرستانہ طرزِ فکر نے جو اس وقت ساری دنیا پر چھایا ہوا ہے اس کو اور بھی مستحکم کر دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر سوچنے والے کا نقطۂ نظر یہی ہے اور شعوری یا غیر شعوری طور پر ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا باعث ان کی سیاسی اور مادّی کمزوری ہے اور ان کا عروج اسی وقت ممکن ہے جب وہ اس حثییت سے طاقت حاصل کر لیں، اس طرح سوچنے والے صاحبان اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ عروج نام ہی مادّی غلبہ کا ہے اور زوال مادی کمزوری اور پستی ہی کو کہتے ہیں اس لیے ان کا یہ کہنا سب سے بڑی بھول ہے کہ مادّی طاقت عروج کا باعث ہوتی اور مادّی ناطاقتی زوال کا، کیوں کہ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ کسی قوم کا مادّی غلبہ اس کے مادّی غلبہ ہی کی وجہ سے ہوتا ہے اور کوئی قوم اگر مادّی اعتبار سے گری ہوئی ہے تو اسی لیے گری ہوئی ہے کہ مادّی اعتبار سے وہ گری ہوئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ بالکل مہمل اور بے معنیٰ بات ہے،

پھر یہ لوگ تاریخ کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں اور قوموں کے حالات و واقعات کا بغور جائزہ لیے بغیر ان کے عروج و زوال کی بحث چھیڑ دیتے ہیں اگر کسی قوم کے ترقی کرتے رہنے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ مادی اعتبار سے مضبوط ہو، اور اس کے ذلیل و خوار اور پست رہنے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ناتواں اور بے سر و سامان ہے تو پھر آج تک کی پوری تاریخ بالکل غلط ہے اور قوموں کے عروج و زوال اور ایک قوم کے ابھرنے اور دوسری قوم کے گرنے کے واقعات بے سر و پا ہیں، ابتدائے آفرینش میں جب کسی قوم کے پاس مادی ذرائع و وسائل زیادہ ہو گئے تھے اور اسے دوسری قوموں کے مقابلہ میں عروج حاصل ہو گیا تھا تو بس اسی کو آج تک ترقی کرتے رہنا چاہئے تھا کیوں کہ وہ مادی اعتبار سے مضبوط تھی اور مادی استحکام عروج و ارتقاء کی ضمانت ہوتا ہے اور دوسری قوموں کو جو اس سے پست تھیں کبھی ابھرنے

کا موقع نہ ملنا چاہئے تھا کیوں کہ انھیں مادی قوت حاصل نہ تھی اور مادی طاقت ہی ابھرنے اور ترقی کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے، لیکن تاریخ گواہ ہے کہ ایسا بالکل نہ ہوا، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک قوم جو کل تک گمنام تھی، پست تھی، حقیر و ناتواں تھی، اٹھتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے آس پاس کی ان قوموں پر چھا جاتی ہے جو اب تک با اقتدار تھیں، اور اس سے کہیں زیادہ مادی طاقت رکھتی تھیں، ان کے تخت اقتدار کو وہ الٹ پھینکتی ہے، ان کو پیروں میں روندتی ہے اور خود غلبہ و اقتدار کی مالک ہو جاتی ہے کچھ عرصہ تک وہ یوں ہی ترقی کرتی رہتی ہے کہ اچانک انھیں قوموں میں سے جو اس کی محکوم تھیں اور اس کے مقابلہ میں کمزور سمجھی جاتی تھیں کوئی قوم اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور غالب قوم سے قوت و اقتدار چھین کر خود اس پر قابض ہو جاتی ہے اور پھر کچھ دنوں کے بعد یہ قوم بھی کسی دوسری قوم کے لیے جگہ خالی کر دیتی ہے اور یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا ہے آج بھی یہ سلسلہ یونہی جاری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مادی ذرائع و وسائل ذرائع کی ہی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کی بڑی قیمت ہے لیکن وہ اسباب اور عوامل کی حیثیت بہر حال نہیں رکھتے ان ذرائع و وسائل کو حاصل کرنے اور استعمال کرنے کے لیے کچھ ذہنی، اخلاقی اور عملی قوتوں کی ضرورت ہے یہ قوتیں اگر کسی فرد یا قوم میں نہ ہوں تو یہ ذرائع نہ صرف یہ کہ اس کے لیے بے کار رہیں گے بلکہ اس سے ان کی حفاظت بھی نہ ہو سکے گی اور یہ اس سے چھن جائیں گے، افراد یا جماعت اور گروہوں کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے، آپ کسی ایسے شخص کو لیجئے جس میں ہمت و جرأت نام کو نہ ہو، جو عزم اور قوتِ ارادی نہ رکھتا ہو، جس میں مصائب جھیلنے اور ثابت قدم رہنے کی صفت بالکل نہ ہو اور جو انتہائی بزدل اور ڈرپوک ہو، اس شخص کو آپ بہترین ہتھیاروں سے مسلح کر دیجئے اور اسے ایک ایسے شخص سے لڑنے بھیج دیجئے جس کے ہتھیار تو کچھ زیادہ اچھے نہیں ہیں مگر وہ جری اور شجاع ہے، صاحبِ عزم و عمل ہے اور ثابت قدم و صابر ہے، آپ دیکھ لیں گے کہ بزدل شخص بہترین اسلحہ رکھنے کے باوجود اپنے حریف سے شکست کھا جائے حریف پر حملہ کرنا تو درکنار اس

کے لیے اپنی اور اپنے اسلحہ کی حفاظت بھی مشکل ہوجائے گی، اسی طرح دو فوجوں کی مثال لے لیجئے ایک فوج تو وہ ہے جو مادی سروسامان میں کچھ کم تو ضرور ہے مگر اس کے ہر ہر سپاہی کے اندر عزم و ولولہ، ہمت و بلند حوصلگی شجاعت و ثابت قدمی، ایثار اور قربانی اور اتحاد و تعاون کی صفات موجود ہیں، اس کے برعکس دوسری فوج کے یہاں سازوسامان کی فراوانی ہے جدید ترین اسلحہ کا میگزین موجود ہے مگر اس کے دل بجھے ہوئے ہیں، ہمتیں ٹوٹ چکی ہیں اور ولولے سرد پڑ چکے ہیں، قدم آگے اٹھانے اور جم کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ نہیں، مشکلات کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے کی جرأت نہیں، مل کر کام کرنے کی خصلت نہیں، اور ان کے دل ایک دوسرے کی طرف سے پھٹے ہوئے ہیں، آپ خود ہی فیصلہ کر دیں گے کہ یقیناً پہلی فوج ہی جیتے گی اور دوسری فوج کو سروسامان کی بہتات کے باوجود ناکامی و نامرادی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا معلوم ہوا کہ اصل فیصلہ کن چیز مادی ذرائع و وسائل نہیں ہوتے بلکہ عزم و ولولہ ہمت و جرأت، ایثار و قربانی، شجاعت و ثابت قدمی اتحاد و تعاون، اور اسی قسم کی دوسری ذہنی، اخلاقی اور عملی صفات ہیں، یہی صفات کسی قوم کے عروج کا باعث ہوتی ہیں، انھیں صفات کو لے کر جب کوئی قوم تھوڑے سے افراد اور قلیل ذرائع و وسائل کے ساتھ اٹھتی ہے تو ان قوموں پر فتح پالیتی ہے جو اگرچہ جاہ و حشم اور سطوت و شوکت میں اس سے کہیں بڑھی چڑھی ہوتی ہیں لیکن ان صفات میں اس سے پیچھے ہوتی ہیں، یہ کشمکش اور فتوحات قوم کی ان صفات کو نشوونما دیتی ہیں اور دولت وحکومت اور تمام مادی ذرائع کے انبار اس کے قدموں میں لاکر ڈال دیتی ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہی قوم جو کل تک مادی اعتبار سے کمزور اور بے سروسامان تھی، دنیا کی سب سے بڑی سب سے زیادہ طاقت رکھنے والی اور سب سے زیادہ دولت رکھنے والی قوم بن جاتی ہے کچھ زمانہ اسی اقبال مندی اور خوش قسمتی کے ساتھ گذرتا ہے پھر رفتہ رفتہ اس قوم میں اخلاقی کمزوریاں پیدا ہونی شروع ہوجاتی ہیں، لوگ دولت و اقتدار کی فراوانی کے باعث آرام طلب اور عیش پسند ہوجاتے ہیں، عملی جدّوجہد سے بھاگنے اور ایثار و قربانی سے جی چرانے لگتے ہیں، وہ

قوم کے پاس مادی اسباب کی بہتات دیکھتے ہیں اور بڑی آسانی کے ساتھ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ترقی و کامیابی کا اصلی ذریعہ دولت و حکومت ہیں، وہ اخلاقی صفات کو فراموش کر دیتے ہیں اور ان کے بغیر ہی کامیابی حاصل کرنا چاہتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا قدم آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے لگتا ہے، اور دوسری قومیں ان پر دست درازیاں کرنے کرنے لگتی ہیں، اندر یہ حال ہوتا ہے کہ قوم کا ہر فرد تعیش کا دلدادہ اور دولت واقتدار کا بھوکا ہوتا ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قوم کی اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور قوم کے افراد آپس ہی میں دست وگریباں ہونے لگتے ہیں، یہ کسی قوم کے زوال کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کے لیے ذلت ونامرادی اور تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ مقدر نہیں ہوتا.

مسلمانوں کی مثال

مسلمانوں کے عروج وزوال کی کیفیت بھی بعینہ یہی ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے اور دین حق کے لیے عملی جدّوجہد کرنے والے کتنے تھوڑے، کتنے کمزور اور کتنے بے سروسامان تھے! ان کے لیے زندہ رہنا اور اپنے ضمیر کی آواز کو برملا کہنا دنیا کا سب سے مشکل کام تھا، ان کے مخالفین کتنے زیادہ سامان کے مالک تھے لیکن اس ظاہری قوت وناتوانی کے تناسب کے علاوہ ایک دوسرا تناسب اور بھی تھا اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے اندر کچھ ایمانی، اخلاقی اور عملی صفات تھیں جو غیر مسلموں میں نہ تھیں انھیں صفات کا نتیجہ تھا کہ مسلمان مادی اعتبار سے انتہائی کمزور اور بہت تھوڑے ہونے کے باوجود چند سال کے اندر قریش اور عرب کے تمام قبیلوں پر نہ صرف غالب آ گئے بلکہ ان کو اپنے اندر جذب کر لیا، اور ان کی تمام صلاحتیں اور قوتیں مسلمانوں کے ساتھ ہو گئیں پھر مسلمان عرب کے ریگستان سے نکلے اور مصر عراق، شام، ایران اور افغانستان کی طرف بڑھے، اس وقت دنیا میں دو عظیم شہنشاہیتیں قائم تھیں، ایرانی شہنشاہیت اور رومن امپائر، ان کے ذرائع ووسائل مسلمانوں کے ذرائع ووسائل سے کہیں زیادہ اور کہیں ترقی یافتہ تھے، ان کی بنیادیں بہت پرانی اور مضبوط تھیں، ان کی تہذیب بہت شاندار

اور قدیم تھی، افراد کی تعداد، دولت کی فراوانی اور علوم و فنون کی ترقی میں وہ مسلمانوں سے کہیں آگے تھے لیکن مسلمانوں کے سیلاب کے آگے وہ نہ رک سکے اور مسلمان دیکھتے ہی دیکھتے ایشیا سے لے کر یورپ اور افریقہ تک چھاتے چلے گئے۔ ایک عرصہ تک مسلمانوں کا یہی حال رہا پھر رفتہ رفتہ وہ اس حقیقت کو بھولتے چلے گئے، کہ ان کا ارتقاء کچھ ایمانی، اخلاقی اور عملی خصوصیات کی بنا پر ہوا تھا وہ مادّی ساز و سامان ہی کو سب کچھ سمجھنے لگے، وہ دولت و اقتدار کے دلدادہ اور جاہ حشم پر فریفتہ ہوگئے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی اخلاقی صفات کھوتے چلے گئے اور اور ان کے قدم جو ان صفات کی وجہ سے بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے کچھ پیچھے ہٹنے لگے، شروع میں یہ اخلاقی و عملی تنزل سست رفتاری کیساتھ تھا کیوں کہ مسلمان ان صفات میں پہلے کے مقابلہ میں اگرچہ کچھ گر گئے تھے، مگر دوسری اقوام کے مقابلہ میں وہ اب بھی بہت برتر تھے، اسی بنا پر وہ ان کے مقابلہ میں طاقتور اور غالب رہے اس چیز نے ان کو اور غلط فہمی میں مبتلا کر دیا، انھوں نے سمجھا کہ اخلاقی و عملی تنزل کے بعد بھی وہ محض مادّی ذرائع و وسائل کے بل بوتے پر ارتقاء کرتے رہیں گے اس چیز نے ان کو ایمانی اور اخلاقی تنزل کی طرف سے غافل کر دیا، اور ان کے انحطاط کی رفتار اور بھی تیز ہوگئی پھر دولت و اقتدار کے مقصود قرار پا جانے کا انجام یہ ہوا کہ مسلمان آپس میں دست و گریباں ہونے لگے، ذرا ذرا سے مادّی فائدوں کے لیے آپس میں تلوار چلی اور امت کا شیرازہ اس طرح بکھر کر رہ گیا کہ اس کے مجتمع ہونے کی بظاہر کوئی امید نظر نہیں آتی، اس طرح وہ دولت و اقتدار کے لیے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہے اور اپنی اخلاقی کمزوریوں سے مسلسل غفلت برتتے رہے نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی قوت کمزور اور منتشر ہو کر رہ گئی آس پاس کی قومیں ان پر ٹوٹ پڑیں، کہیں سے انھیں نکالا گیا، کہیں ان کا قتل عام ہوا کہیں ان کے ہاتھ سے حکومت و اقتدار چھینا گیا اور جہاں ان کی حکومتیں باقی رہیں وہاں غالب قوموں نے انھیں اپنے اشاروں پر نچایا، اپنے مقاصد کے لیے آلہ کار بنایا اور انھیں ایک دوسرے کی طاقت کمزور کرنے کے لیے استعمال کیا،

یہ ہے مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ! اس سے ہمیں ایک ہی سبق ملتا ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے ذہن سے یہ بالکل نکال دیں کہ مادی ذرائع و وسائل ہمارا مقصود ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں اپنوں سے یا غیروں سے کشمکش کرنی ہے، یہ غلط فہمی بھی ہمارے ذہن میں باقی نہ رہنا چاہیے کہ قوم کا ارتقاء، مادی طاقت کی بنا پر ہوتا ہے، ہمیں اچھی طرح یہ بات جان لینا چاہیے کہ قوموں کے عروج کے اسباب ذہنی اخلاقی اور عملی ہوتے ہیں جن کے مہیا ہونے کے بعد مادی ذرائع و وسائل کی ضرورت پڑتی ہے اور اس وقت ان کے مہیا کرنے کی کوشش کرنی بھی چاہئے اور وہ مہیا ہو بھی جاتے ہیں، ان خصوصیات کو پیدا کیے بغیر مادّی طاقت حاصل کرنے کے پھیر میں رہنا ایک حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں، نہ تو ان صفات کے بغیر یہ طاقت حاصل ہو سکے گی، اور نہ وہ قائم رہ سکے گی، بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ جو کچھ طاقت ہے وہ بھی کہیں ہاتھ سے نہ نکل جائے، اور زندگی کے جتنے امکانات ہیں وہ بھی ختم نہ ہو جائیں،

بنیادی صفات

وہ صفات جو قوموں کے عروج و ارتقاء کی ضامن ہوتی ہیں۔ یوں تو بہت ہیں اور سب کی سب کسی نہ کسی حد تک ضروری ہیں مگر ان میں سے چار صفتیں بنیادی ہیں، اور اگر وہ موجود ہوں تو باقی صفات آپ سے آپ پیدا ہو جاتی ہیں،

ان میں سے پہلی صفت یہ ہے کہ قوم کا نصب العین اور مقصد زندگی متعین ہو، اس کے ہر ہر فرد کو اس کا یقین اور عشق ہو اور یہ مقصد انھیں دنیا کے سارے مقاصد سے زیادہ عزیز اور محبوب ہو، یہ سب سے پہلی اور اہم بنیاد ہے، اگر یہ موجود نہ ہو تو ترقی و کامیابی کا کوئی امکان نہیں، تاریخ اٹھا کر دیکھ جائیے، کیا کبھی ایسی قوم نے کوئی ترقی کی ہے جس نے اپنا کوئی نصب العین طے نہ کیا ہو، جسے یہی نہ معلوم ہو کہ اس کا مقصد کیا ہے، جس کا مقصد تو متعین ہو مگر جس کے افراد یقین و اذعان سے خالی ہوں؟ یقیناً بے مقصد زندگی گذار دینے

والوں نے اپنے پیچھے اپنا کوئی اثر نہیں چھوڑا ہے، ریب وتذبذب کے بیماروں نے دنیا میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا ہے اور مقصد سے والہانہ عشق و محبّت نہ رکھنے والوں نے عالم میں کبھی بھی انقلاب برپا نہیں کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کسی مقصد کا یقین ہی انسان کی عملی قوتوں کو ابھارتا اور اسے جدوجہد کے لیے بے چین کرتا ہے اور کسی اہم چیز کا عشق و جنون ہی انسان کو سرتاپا عمل بنا دیتا ہے اس کی صلاحیتوں کو ترقی دیتا ہے اور خفتہ قوتوں کو بیدار کر کے کام میں لاتا ہے۔

اس کے بعد دوسری اہم صفت یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی قوم کے اندر عمل کرنے کا ولولہ اور عملی اقدام کرنے کا داعیہ موجود ہو جس مقصد کو وہ اپنی زندگی کا مقصد بنائیں، زندگی کی تمام طاقتیں وہ اسے حاصل کرنے میں لگا دیں وہ ہر اس کام کو کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہیں جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہو، اپنے اوقات، اپنی صلاحتیں، اپنی دولت اور اپنے تمام ذرائع و وسائل اس مقصد کے حاصل کرنے میں صرف کر دیں اس کے لیے مسلسل جدّوجہد کرتے رہیں اور جب تک اسے حاصل نہ کرلیں چین اور سکون سے نہ بیٹھیں، یہ دوسری اہم صفت ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا ہونا بھی ناگزیر ہے، محض کسی مقصد کو اپنا لینے یا اس پر یقین رکھنے اور اس سے محبت کرنے کے دعوے سے دنیا میں آج تک کوئی کام نہیں ہوا ہے فیصلے اور ارادے کے بعد عمل کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور وہ یقین نہیں جس سے عمل پیدا نہ ہو اور اس فیصلے کی انسانی دنیا میں کوئی قیمت نہیں جس پر عمل نہ کیا گیا ہو، ترقی و کامیابی تو جدوجہد اور عمل پیہم ہی سے حاصل ہو سکتی ہے بھلا وہ قوم کیا پا سکتی ہے جو مقصد کو جاننے اور اپنانے کے بعد اس کے لیے ہاتھ پاؤں ہلانے پر آمادہ نہ ہو، یہاں تو انسان کو وہی ملتا ہے جس کے لیے وہ جدوجہد کرتا ہے اور قومی و اجتماعی مسائل تو انفرادی مسائل سے زیادہ جدوجہد کے طلب گار ہوتے ہیں لیکن تنہا عمل کافی نہیں اس قسم کے عمل اور اس طرح کی سعیٔ پیہم کی ضرورت ہے جو مقصد کے عین مطابق اور اس کے

حصول کا حقیقی ذریعہ ہو، جو عمل ایسا نہ ہوگا، وہ مقصد سے قریب کرنے کے بجائے اس سے دور کرنے ہی کا باعث ہوگا، پھر ضروری ہے کہ مقصد کے حصول کی جدّ وجہد قوم کا کوئی ضمنی پروگرام نہ ہو بلکہ اسے قوم کی نظروں میں اہم ترین مقام حاصل ہو اور وہ اس کی تمام کوششوں کا محور و مرکز ہو، ورنہ انفرادی مقاصد و مفادات غالب آجائیں گے، اور مقصد صرف ذہن و دماغ کی حد تک محدود ہو کر رہ جائے گا، اور وہ بھی ضمنی مقصد ہو کر۔

قوت کس چیز کا نام؟ صرف اس چیز کا کہ کوئی شخص یا قوم اپنی تمام ذہنی، اخلاقی، عملی اور مادی قوتیں پوری یکسوئی، توجّہ اور شدت کے ساتھ کسی ایک نقطے پر مرکوز کر دے اور کسی ایک مہم میں بے دریغ جھونک دے، قوت نام ہے انسان کی صلاحیتوں کے مجتمع ہونے کا، اور کمزوری نام ہے انسان کی صلاحیتوں کے بکھر جانے اور منتشر طریقہ پر صرف ہونے کا، جو شخص اپنی زندگی کا ایک مقصد طے کر لیتا ہے اور اس کے لیے اپنی تمام صلاحیتیں اور طاقتیں لگا دیتا ہے وہ غیر شعوری طور پر اپنی قوت کو ایک نقطہ پر مجتمع کر لیتا ہے اور یہی بات اس کی طاقت و قوت کا باعث ہوتی ہے اسی طرح اگر کوئی قوم یا جماعت اپنے افراد کی انفرادی و اجتماعی طاقتوں کو منتشر طریقہ پر ضائع نہیں ہونے دیتی، انھیں مختلف مقاصد میں صرف ہونے سے بچا کر ان کو مجتمع کر کے ایک بنیادی مقصد میں لگا دیتی ہے تو وہ اس طرح اپنی قوتوں کو محفوظ کر لیتی ہے، اپنے مقصد کو پالیتی ہے اور اپنے پاس قوت کا ایک عظیم الشان خزانہ مہیا کر لیتی ہے۔

تیسری بنیادی چیز یہ ہے کہ اس مقصد کے یقین، عشق اور عمل کے سلسلے میں قوم کا ہر ہر فرد دوسرے فرد پر اور قوم بحیثیت مجموعی تمام افراد پر کڑی نظر رکھے اور اس بات کا ہرگز موقع پیدا نہ ہونے دے کہ کہیں سے بھی شکوک و شبہات رخنہ اندازی کر کے مقصد اور اجتماعیت کو نقصان پہنچا سکیں یا مقصد کے خلاف کوئی آواز اٹھے اور سارے نظام اور پروگرام کے لیے خطرہ کا باعث ہو، نیز لوگوں میں سستی بے عملی اور جمود کو پیدا نہ ہونے دیا جائے

اور اگر یہ خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں تو ان کی بروقت روک تھام کی جائے، اور ان کے ساتھ کسی قسم کی رواداری نہ برتی جائے، اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا نگراں ہونے کے ساتھ دوسروں کا بھی نگراں ہو، وہ اگر کہیں کوئی بات خلاف مقصد ابھرتے دیکھے تو بے چین ہو جائے اور بڑھ کر اسے وہیں روک دے، کسی شخص میں کوئی خامی پائے تو اسے دور کرنے کی پوری کوشش کرے اور ہمدردی و محبت اور موعظت و حکمت کے ساتھ اس شخص کو اس خامی سے بچنے اور اس کی تلافی کرنے کے لیے آمادہ کرے، کسی شخص کے یقین میں کوئی کھوٹ پائے تو دلائل و براہین سے اسے یقین میں تبدیل کرنے کی سعی کرے، کسی شخص کو مقصد کے سلسلے میں کمزوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھے تو اس کے اسباب معلوم کرے اور اس کی قوتِ بازو بنے، کسی کو لڑکھڑاتا پائے تو اسے سہارا دے، ہر شخص اپنے ماتحتوں اور اپنی اولاد و متعلقین کو مقصد کا جاں نثار و وفادار بنانے کی تدبیریں کرے اور اگر ان سب کوششوں کے باوجود اصلاح نہ ہو سکے تو برائی کو یوں ہی پھیلنے اور فتنے کی شکل اختیار کرنے کا موقع نہ دے بلکہ قوم کے ذمے داروں کو بروقت باخبر اور انھیں اصلاح ماحول کے لیے متوجّہ کرے اور اس سلسلے میں مروّت یا قرابت و دوستی کا ہرگز لحاظ نہ کرے۔

اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ قوم میں ایک اجتماعی نظم ہو جس کی سب اطاعت کرتے ہوں، اس نظم و اقتدار کا فرض ہے کہ افراد کی قوتوں کو یکجا کر کے مقصد کے حصول میں لگا دے، نیز وہ اس بات کی پوری نگہداشت کرے کہ کہیں سے اس مقصد کے خلاف کوئی بے اطمینانی، کوئی مخالفت یا کسی قسم کی سُستی رُونما نہ ہونے پائے اور اگر کہیں ایسے آثار نظر آئیں تو پورے تدبر اور قوت کے ساتھ اس کا برمحل اور بروقت تدارک کیا جائے اس کے لیے اس سلبی پروگرام کے علاوہ ضروری ہے کہ دعوت و تبلیغ کا انتظام کیا جائے جس سے قوم کے ایک ایک فرد کا یقین پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا جائے اور امتدادِ زمانہ کی وجہ سے یقین میں جو کمزوری، جذبات میں جو مردنی اور عمل میں جو سستی پیدا ہو جاتی ہے وہ مسلسل

دور ہوتی رہے، ماحول کو ہر اس چیز سے برابر پاک کیا جاتا رہے جو مقصد میں رکاوٹ بن سکتی ہو اور ایسے تمام حالات و ذرائع پیدا کیے جاتے رہیں جو یقین میں اضافہ، جذبات میں شدت اور عمل میں پختگی و افزونی کا باعث ہوں، پھر تعلیم و تربیت کا ایک عمومی انتظام ہو جو آئندہ نسلوں کو اس مقصد کا علمبردار بنائے اور ان میں اس نصب العین کا یقین و عشق پیدا کرے، پھر اگر وہ مقصد ایسا ہو جسے ایک مخصوص قوم کے علاوہ دوسرے انسان بھی قبول کر سکتے ہوں یا اس کی حمایت کر سکتے ہوں تو ان کو بھی اس مقصد کا حامی و معتقد بنانے کی جدوجہد کی جاتی رہے اور باہر سے جو لوگ بھی آگے بڑھیں ان کو ساتھ لیا جائے اور اس طرح قوت میں مزید اضافہ کیا جائے۔ قوم کے افراد میں سے اگر کوئی فرد ان تمام کوششوں کے باوجود بگڑتا ہی چلا جائے اور اس کے سدھرنے کی کوئی امید باقی نہ رہ جائے تو اس کے ساتھ کسی قسم کی رعایت برت کر بگاڑ کو پھیلنے اور جگہ کر لینے کا موقع ہرگز نہ دیا جائے بلکہ اسے بے مروّتی کے ساتھ قوم سے کاٹ پھینکا جائے یا اگر اس حد تک نہ بگڑا ہو تو جرم کے مطابق اسے سزا دی جائے۔

قوموں اور جماعتوں کے ارتقاء کرتے رہنے کے لیے یہ پروگرام بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور جب تک وہ اس پر پوری سختی کے ساتھ کاربند نہ ہوں کمزوری و پستی سے بلندی و اقتدار کی منزل تک پہنچ نہیں سکتیں اس لیے ہر دانشمند قوم اور سمجھ دار گروہ اس کا پورا اہتمام کرتا ہے اور اسی کی بدولت وہ ترقی کرتا چلا جاتا ہے، لیکن جب اس کے افراد زیادہ اور اس کے مادّی ذرائع و وسائل افزوں ہو جاتے ہیں اور اس کے مخالفین میدان سے ہٹ جاتے یا کمزور پڑ جاتے ہیں تو اس کا یہ پروگرام بھی سست پڑ جاتا ہے اس کی اہمیت اس کی نظر میں کچھ کم ہونے لگتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر گوشے سے فتنے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ہر طرف بغاوت کے رجحانات پرورش پانے لگتے ہیں، عوام کے بگڑنے کے ساتھ نظامِ اقتدار بھی بگڑنے لگتا ہے، مصلحتوں اور مروّتوں کی خاطر غلطیوں اور خلاف ورزیوں کو برداشت کیا جاتا اور پھیلنے دیا جاتا ہے مادی اقتدار کی ہوس جب آپس میں پھوٹ

ڈال دیتی ہے تو یہ پروگرام اور بھی سست پڑجاتا ہے لوگوں کی توجہ اکثر وبیشتر اس بنیادی کام سے ہٹ کر طاقت ودولت کے حصول میں لگ جاتی ہے اقتدار کے ٹکڑے ٹکڑے یا کمزور ہوجانے کی وجہ سے فتنوں کی روک تھام نہیں ہوپاتی اور نہ دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتربیت کا معقول انتظام ہوپاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہرنسل پچھلی نسل سے بدتر اٹھتی ہے اور ایک وقت وہ آتا ہے جب قوم اپنے مقصد کو بھلاچکی ہوتی ہے یقین واذعان سے خالی اور بے یقینی اور ریب وتذبذب کا شکار ہوچکتی ہے، بے عملی، تعطل اور سخت وجمود کا گھن اس کو لگ جاتا ہے اور اس کا اجتماعی شیرازہ کسی مقصد کے نہ ہونے کی وجہ سے بالکل بکھر جاتا ہے، اس منزل پر پہنچنے کے بعد اس کی تباہی کے دن بہت قریب آجاتے ہیں، چوتھی اخلاقی صفت جو قوموں کے عروج وزوال کے سلسلہ میں بنیادی اہمیت رکھتی ہے ثابت قدمی واستقامت کی صفت ہے مقصد کے عشق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان اس کی خاطر سختیاں جھیلے مصائب ومشکلات کا مقابلہ کرے اور ہر قیمت پر اسے حاصل کر کے رہے اس دنیا میں کامیابی کا راز بھی یہی ہے، وہی شخص کامیاب ہوتا ہے جو اپنے مقصد کے لیے رات کی نیندیں اور دن کا عیش حرام کر لیتا ہے، یہاں عیش پسند، پست ہمت، کاہل اور تھڑدلے انسانوں کے لیے کوئی کامیابی نہیں ہے، یہ افراد کا حال ہے، قوموں اور جماعتوں کا معاملہ اس سے زیادہ اہم اور شدید ہے ان کے مقاصد بڑے اور وسیع، ان کی جدوجہد طویل اور ہمہ گیر اور ان کا کام کٹھن اور نازک ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سب ایثار قربانی اور ثابت قدمی کے بغیر نہیں ہوسکتا، اس زمین پر اربوں انسان رہتے ہیں جن کے مقاصد گوناگوں اور ایک دوسرے کے خلاف ہیں، یہاں مختلف نظریات وافکار پوری شدت کے ساتھ پھیلے ہوئے ہیں، ہر ہر نظریہ اور فکر کی سربلندی کے لیے بڑی بڑی تنظیمیں ہیں انسانوں کے منظم اور بڑے بڑے جتھے ہیں ذرائع ووسائل کے ذخائر اور خزانے ہیں کامیابی حاصل کرنے کے لیے پرپیچ اور خطرناک اسکیمیں ہیں ہر تحریک کے ساتھ جانبازوں اور سرفروشوں کی ایک کثیر تعداد ہے جو اپنا سب

کچھ قربان کر سکتی ہے لیکن مقصد سے دست بردار نہیں ہو سکتی، جو اپنے مقصد کے لیے ہر دم قربانیاں، سرفروشیاں اور جانبازیاں کر رہی ہے ایک ایسی دنیا میں اگر کوئی قوم کسی مقصد کو اپناتی ہے اور کوئی جماعت کسی نصب العین کو لے کر اٹھتی ہے تو کیا صبر و استقامت کے بغیر وہ اپنے مقصد پر کچھ بھی عمل کر سکتی ہے؟ کیا آسائشوں اور مزوں کے تجے بغیر وہ ذرا بھی آگے بڑھ سکتی ہے؟ کیا ایثار و قربانی کے بغیر کچھ بھی پا سکتی ہے؟ کیا مسلسل جدوجہد اور پیہم سعی و اقدام کے بغیر وہ کبھی بھی کامیاب ہو سکتی ہے؟ اور کیا دوسری قومیں اور جماعتیں ایڑی چوٹی کا زور لگائے بغیر میدان سے ہٹ سکتی ہیں، اور اپنے مقاصد اور مفادات کے بجائے کسی نئے مقصد کو آسانی کے ساتھ کامیاب ہونے دے سکتی ہیں؟ پچھلے زمانوں میں بھی جب کہ قوموں کی کشمکش کم تھی، جب کہ انقلابات بہت دیر دیر میں آتے تھے جب کہ ذرائع و وسائل بہت محدود تھے اور جب کہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے کے مواقع بہت کم تھے، کوئی قوم صبر و استقامت اور ایثار و قربانی کے بغیر ترقی و کامیابی حاصل نہیں کر سکتی تھی، آپ تاریخ اٹھا کر دیکھا جائے آپ کو ایک قوم بھی ایسی نہ ملے گی جسے مشقتیں جھیلے اور مصیبتیں برداشت کئے بغیر عروج حاصل ہو گیا ہو، آپ کو یہی نظر آئے گا کہ ہر ابھرنے والی قوم میں سب سے زیادہ نمایاں صفت یہی ثابت قدمی و استقلال کی صفت ہے، آپ دیکھیں گے کہ ہر گرتی ہوئی قوم ان صفات سے خالی ہے، اس کے افراد کام چور، عیش پرست، آرام طلب اور ڈرپوک ہیں، وہ انگلی ہلائے بغیر سب کچھ حاصل کر لینا چاہتے ہیں اور مصائب و خطرات میں پڑے بغیر فوائد و منافع کے ذخیروں پر قابض ہونا چاہتے ہیں ان میں آگے بڑھنے اور دوسری قوموں کو پسپا کرنے کا ولولہ تو درکنار اپنے مقام پر جمے رہنے اور سینہ سپر ہو کر مقابلہ کرنے کا حوصلہ بھی نہیں ہے اور آپ نتیجہ یہ دیکھیں گے کہ انھیں مقامِ عزت سے پستی و خواری کے گڑھوں میں گرا دیا گیا، کثرت تعداد اور ذرائع و وسائل کی فراوانی کے باوجود ان کا کوئی وزن نہیں رہا، مصائب کے پڑتے ہی ان کا شیرازہ

منتشر ہوگیا، ایک دو ٹکروں ہی میں ان کی عقلیں جواب دے گئیں اور ان کے قوائے عمل ٹھٹھر کر رہ گئے، اور اس کے بعد یا تو انھیں صفحۂ ہستی سے مٹ جانا پڑا یا ذلت و خواری کا نمونہ بن کر عبرت روزگار ہوگئیں۔

موجودہ دور

یہ گذشتہ ادوار کا حال ہے، لیکن آج کل کا معاملہ کہیں زیادہ نازک ہے، یہ دور مسلسل جدوجہد کا دور ہے اور اس میں لگاتار ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا آج ہر قوم کو دوسری قوم سے مسلسل کشمکش کرنا پڑ رہی ہے اب انقلابات بہت جلد جلد آرہے ہیں اور ایک انقلاب کی تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی دوسرا انقلاب شروع ہوجاتا ہے ان انقلابات سے دنیا کا کوئی خطہ محفوظ نہیں ہے آج ساری دنیا ایک ہوچکی ہے اس لیے اب کوئی قوم اپنے خول کے اندر سمٹ کر نہیں رہ سکتی، دنیا کے بعید ترین گوشہ میں جو انقلاب رونما ہوتا ہے اس سے بھی محفوظ رہنا مشکل ہے، قوموں کی حرص بہت بڑھ چکی ہے اور اس لیے وہ ہر وقت دوسری قوموں کو تاکتی رہتی ہیں اور انھیں اپنا لقمہ بنانے کی فکریں اور چالیں چلتی رہتی ہیں، انسان کے ذرائع و وسائل بہت ترقی کرچکے ہیں۔ دوسری قوموں پر چھا جانے، انھیں اقتدار، دولت، سکون اور زندگی کی صلاحیتوں سے محروم کر دینے اور انھیں تباہ و برباد کر دینے کے ایسے ذرائع ایجاد ہوچکے ہیں جن سے آناً فاناً حالات بدل سکتے ہیں اور ذرا سی غفلت، سستی یا آرام طلبی کے باعث قوم کو بامِ عروج سے گرا کر قعر ذلت میں پھینک سکتے ہیں۔ ان حالات میں کس قدر تدبر، کتنی ہوشیاری، کتنی جدوجہد اور کس قدر زیادہ صبر و استقامت ناگزیر ہے، یہ بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے، موجودہ سو سال میں جن قوموں نے کسی مقصد کو اپنایا اور جو ترقی و کامیابی کی منزل تک پہنچیں ان کی کارگذاریاں اور قربانیاں آپ کے سامنے ہیں، انگریز ہوں یا جرمن، روسی ہوں یا اطالوی و فرانسیسی، جاپانی ہوں یا ترکی، ان میں سے کس کو سخت مقابلہ کرنا نہیں پڑا ہے اور ان میں سے کسے پیہم

جدوجہد اور مسلسل مصائب و شدائد اٹھائے بغیر کوئی کامیابی حاصل ہوگئی ہے، خود ہندوستان کی آزادی کتنی قربانیوں کے بعد حاصل ہوئی ہے، پاکستان کتنی خونریزیوں اور کشمکشوں کے بعد وجود میں آیا ہے؟ انڈونیشیا کو نام نہاد آزادی کتنی مصیبت کے بعد ملی ہے، فلسطین کے لیے عربوں اور یہودیوں کو کیا کچھ کرنا پڑا ہے، اشتراکی اشترکیت کو غالب کرنے کے لیے پوری دنیا میں کس قدر تگ و دو کر رہے ہیں، کن کن پرخار وادیوں سے گذر رہے ہیں، اور کیسے کیسے پرخطر معاملات میں انھیں آئے دن کو دنا پڑتا ہے، چین میں انقلاب کرنے کے لیے کتنی طویل اور کس قدر جانگداز جدوجہد کرنی پڑی ہے اور کس طرح ایک ایک چینی کو فقر و فاقہ خوف و دہشت اور تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا ہے؟ غرض یہ کہ یہاں اسی قوم نے کچھ پایا ہے جس نے ثابت قدمی کے ساتھ کسی مقصد کو اپنایا ہے اور اس کی خاطر ہر طرح کی قربانیاں کیں ہیں، یہاں قوموں کے عروج کے لیے مقصد کا عشق، مقصد کے لیے جدوجہد، مقصد کی تعلیم و تبلیغ و نگہداشت اور مقصد کے لیے ایثار و قربانی و ثابت قدمی، یہ چار بنیادی اور ناگذیر شرطیں ہیں ان کے بغیر کسی قوم نے نہ ترقی کی ہے اور نہ آج کرسکتی ہے،

چند سوالات جو کچھ اوپر عرض کیا ہے وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی سوچنے سمجھنے اور دنیا اور قوموں کے حالات پر نظر رکھنے والا شخص مشکل ہی سے انکار کرسکتا ہے، لیکن یہاں کچھ اور سوال پیدا ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں بھی ابھر رہے ہوں، آگے بڑھنے سے پہلے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ان پر غور کرلیں، ہم دیکھتے ہیں کہ یہ چاروں بنیادی صفات کسی قوم میں موجود ہوتی ہیں مگر دوسری قوموں کے مقابلہ میں وہ بعض دفعہ کامیابی حاصل نہیں کرپاتی، وہ بڑے زور شور سے اٹھتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری دنیا پر چھا جائے گی مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ پسپا اور ناکام ہوتی ہے اور تباہ و برباد ہوکر رہ جاتی ہے، جرمنی کی مثال ہمارے سامنے

ہے، جرمنی کا ہر ہر شخص کس طرح نازیت پر یقین اور اس کے ساتھ عشق رکھتا تھا، کس طرح پوری قوم نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنی تمام قوتیں جھونک دیں اور بے مثال عملی جدوجہد کا مظاہرہ کیا، کس صبر و استقامت اور ایثار و قربانی کے ساتھ اس نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی اور کس طرح دیکھتے دیکھتے وہ دنیا پر چھاتی چلی گئی، لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد اسے ناکامی سے دوچار ہونا پڑا، اور اس کے بعد جرمنی کا جو عبرتناک انجام ہوا اس سے کون شخص ناواقف ہے، سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا؟ پھر بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ قوم کو کامیابی حاصل ہوتی ہے، مگر وہ کامیابی صرف چند روز کی بہار ہوتی ہے کچھ ہی زمانے کے بعد اس سے یہ دولت چھن جاتی ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے قعرِ مذلت میں پھینک دی جاتی ہے، جاپان اس کی واضح مثال ہے جاپان نے آناً فاناً ترقی کی اور ایشائی ملک ہونے کے باوجود اس نے صنعت و حرفت میں یورپین ممالک کا مقابلہ کیا، اور تھوڑے ہی عرصے میں دنیا کی ایک طاقت شمار ہونے لگا، لیکن اس کا یہ عروج ناپائدار ثابت ہوا، پچھلی عالم گیر جنگ میں انتہائی جدوجہد اور بے نظیر قربانیوں کے باوجود اسے سپر ڈال دینی پڑی، اور اتحادی ممالک کی غلامی کا پھندا اس کے گلے میں پڑ گیا، یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا ہیں اور کس طرح ترقی و کامیابی کو پائدار بنایا جا سکتا ہے، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ قوم یا جماعت کو کامیابی حاصل ہو جاتی ہے لیکن اسی ترقی و کامیابی میں اس کی ناکامی پوشیدہ ہوتی ہے اور کامیابی حاصل ہوتے ہی وہ تیزی سے زوال کی طرف بڑھنے لگتی ہے، ہندوستان ہی کو لے لیجیے کانگریس اور لیگ نے اپنے اپنے مقاصد کے لیے جدّوجہد کی اور اس کی ضروری شرطیں پوری کیں، نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں جماعتیں کامیاب ہو گئیں، ہندوستان آزاد ہو گیا، اور زمام کار کانگریس کے ہاتھ میں آگئی، پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور تخت حکومت پر لیگ متمکّن ہو گئی، لیکن اس کے بعد ہی سے ان دونوں جماعتوں کو گھن لگنا شروع ہو گیا ان کی مقصدیت اور عملیت ختم ہو کر رہ گئی، ان کا شیرازہ

بکھرتا جارہا ہے اور ان کی مقبولیت کم ہوتی جاتی ہے اور آج حال یہ ہے کہ دونوں کا اقتدار خطرہ میں ہے اور دونوں سے عوام غیر مطمئن ہیں، حالانکہ ابھی تک تین چار سال ہی کی مدّت گذری ہے، کہ یہی دو جماعتیں ملک میں سب سے زیادہ مقبول اور سب سے زیادہ با اثر تھیں، سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا اور کامیابی ناکامی میں کیوں تبدیل ہوگئی، ان سوالات کے علاوہ ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ ان سب سے زیادہ اہم ہے، آج ہم دیکھتے ہیں کہ قوم اپنے اصولوں کے مطابق ترقی وکامیابی کے لیے جدوجہد کررہی ہے اور وہ اپنی اس جدوجہد میں کسی نہ کسی حد تک ضرور کامیاب ہوجاتی ہے لیکن جس قدر وہ کامیابی کے مراحل طے کرتی جاتی ہے انسانیت کے لیے عذاب اور تباہی وبربادی کا باعث بنتی جاتی ہے، دنیا کو اس کے عروج و ارتقاء سے ناکامی ونامرادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، پھر خرابی صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ دوسری قوموں کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ حالات کا بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار وثروت کے خزانے بہم ہونے کے بعد بھی کسی قوم کے تمام افراد کامیاب نہیں ہوتے، چند کے حصے میں کامیابی، خوشحالی اور لامحدود ترقی ہوتی ہے اور باقی بدستور ناکام رہتے ہیں، قوم کا ایک طبقہ یا ایک پارٹی برسر اقتدار ہوتی ہے اور باقی دولت واقتدار کے خزانوں سے محروم رہ جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلسل کشمکش رہتی ہے اور کامیابی کے ساتھ ساتھ انسانیت کی اور خود اسی قوم کی ناکامی کے اسباب پیدا ہونے شروع ہوجاتے ہیں اور بالآخر پوری دنیا کو تباہ وبرباد کرنے کے بعد وہ تباہی کا شکار ہوجاتی ہے، روس، امریکہ اور برطانیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے ان کی ترقیاں اور سربلندیاں جتنی بڑھتی جاتی ہیں قوموں کا سکون واطمینان، ان کی آزادی وخوشحالی اور ان کی ترقی وکامیابی ختم ہوتی جاتی ہے اور امنِ عالم خطرہ میں پڑتا جاتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ خود ان تینوں ملکوں کے عوام اور مختلف طبقات ناکامی ونامرادی کی بھینٹ ہوتے جاتے ہیں اور کشمکش وبے اطمینانی کا لاوا اندر ہی اندر پکتا جاتا ہے، آئے دن کی خانہ

جنگیاں اسی کا نتیجہ ہیں اور تیسری عالم گیر جنگ کا خوف اور اس کی تیاریاں اسی کا ثمرہ ہیں، سوال یہ ہے کہ یہ کامیابی ہے یا ناکامی، یہ عروج ہے یا پستی؟ ظاہر ہے کہ ناکامی ہے تو پھر اس کے اسباب کیا ہیں،؟ کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں جس سے تمام دنیائے انسانیت کامیابی و ترقی کی دولت پا سکے اور ہر ہر انسان اور ہر ہر طبقے کو اطمینان و سکون حاصل ہو۔

بنیادی خرابیاں

اگر آپ ان ناکامیوں کا اچھی طرح جائزہ لیں جن سے قوموں اور پوری دنیائے انسانیت کو دوچار ہونا پڑ رہا ہے تو آپ کو ان کی تہ میں چند بنیادی خرابیاں نظر آئیں گی یہی خرابیاں کامیابی کو ناکامی سے بدل دیتی ہیں اور قوموں کی تقدیر کا پانسہ الٹ دیتی ہیں۔ آیئے ان پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔

سب سے اہم اور عام خرابی یہ ہے کہ قوموں نے غلط اور مضر مقاصد کو اپنا نصب العین بنالیا ہے، وہ انھیں مفید اور صحیح سمجھتی ہیں اور اپنا سارا سرمایہ اور تمام قوتیں انھیں حاصل کرنے میں لگا دیتی ہیں لیکن جتنی جتنی انھیں کامیابی حاصل ہوتی جاتی ہے تلخیاں اور نقصانات اسی تناسب سے بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ کامیاب اور بامراد ہونے کے بعد انھیں محسوس ہوتا ہے کہ وہ بالکل ناکام و نامراد ہیں اور ان کی کتھیاں جوں کی توں الجھی ہوئی ہیں، آج آپ مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک پورے کرۂ زمین پر نظر ڈال جایئے، آپ دیکھیں گے کہ تمام قوموں نے انسانیت و اخلاق سے بے نیاز ہو کر مادی مقاصد کو عزیز ترین مقاصد کا مقام دے رکھا ہے اور انھیں کے لیے جیتی اور انھیں کے لیے مرتی ہیں اور انھیں کے لیے ساری جدوجہد کرتی ہیں۔

مادّی مقاصد

ان مادّی مقاصد کا برا پہلو یہ ہے کہ یہ قوموں کو باہم لڑاتے ٹکراتے ہیں، جب کوئی قوم ان مقاصد کو لے کر اٹھتی ہے تو دوسری قوموں

کو خطرہ محسوس ہوتا ہے اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتی ہے کہ زمین کے وسائل و ذرائع میں سے یہ قوم بھی لے اڑے گی، اور اب ہمارا حصہ کم ہو جائے گا، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے حصے پر بھی قابض ہو جائے کیوں کہ اخلاق و انسانیت کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دوسری قومیں برابر اسے گرانے کے در پے رہتی ہیں پہلے تو مختلف قسم کی چالوں اور ہتھکنڈوں سے اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتی ہیں، لیکن جب وہ کامیاب نہیں ہوتیں اور دیکھتی ہیں کہ یہ قوم ترقی کرتی اور خزائن رزق پر قبضہ کرتی چلی جارہی ہے تو متفقہ محاذ بنا کر میدان میں کود پڑتی ہیں اور اس کے خلاف جنگ کا ہنگامہ برپا کر دیتی ہیں اس طرح اس قوم کی کامیابی گھٹائی میں پڑ جاتی ہے اور دنیا کا امن و سکون الگ غارت ہو جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج کسی قوم کی ترقی دوسری قوموں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی اور تمام قوموں میں ایک مسلسل اور ہمہ گیر کشمکش جاری ہے۔

ان مقاصد کا دوسرا برا پہلو یہ ہے کہ اگر بعد از خرابی بسیار کسی قوم کو ان میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے تو پھر اس کے افراد میں باہم کشمکش ہونے لگتی ہے مفادات کی تقسیم کے لیے آپس میں جھگڑے پیدا ہو جاتے ہیں، اور ہر طبقہ ہر گروہ اور ہر فرد ان مفادات پر زیادہ سے زیادہ قبضہ کرنا چاہتا اور دوسروں سے انھیں جھپٹ لینا چاہتا ہے۔ دولت و اقتداریوں بھی جنگ کا باعث ہوتے ہیں اور اس صورت میں تو جنگ و کشمکش کا پیدا ہونا بالکل لازمی ہے جب کہ قوم کے ایک ایک فرد کو مادّی مقاصد کے مقصدِ زندگی ہونے کا یقین ہو اور مادّی مفادات کی اہمیت ان کے دلوں میں اچھی طرح جاگزیں ہو چکی ہو، قوموں کی خانہ جنگی کا بہت بڑا سبب یہی ہے۔

مادّی مقاصد کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ قوموں کو زندگی کی صلاحیتوں سے محروم کر دیتے ہیں، مضمون کی ابتدا میں واضح کیا جا چکا ہے کہ اخلاقی صفات قوموں کی کامیابی

وترقی کی ضامن ہوتی ہیں اور ان سے محروم ہونے کے بعد کوئی قوم زیادہ عرصہ تک کامیاب و بامراد نہیں رہ سکتی، مادی مفادات کے مقصود قرار پا جانے کے بعد اخلاقی صفات کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے اور انسان ان سے غفلت برتنے لگتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوموں کی بنیادیں کھوکھلی ہوجاتی ہیں اور وہ اقتدار و دولت کی معراج حاصل کر چکنے کے بعد بھی حقیقی کامیابی کی نعمت سے بے بہرہ رہتی ہیں، ان کی زندگی سکون سے محروم اور ان کے ذہن یقین سے خالی ہوتے ہیں ان کی سیرتیں ناقابل اعتماد ہوجاتی ہیں اور ان کی قوتِ مقاومت کمزور سے کمزور تر ہوجاتی ہے یہاں تک کہ وہ کشمکش حیات میں سست پڑنے لگتی ہیں، مسابقت میں پیچھے رہ جاتی ہیں، اور ناکامی و نامرادی کا شکار ہوجاتی ہیں، مادّی مقاصد کو جب کبھی مطمحِ نظر بنایا جائے گا، تو یہی نتائج برآمد ہوں گے اور اگر ان نتائج سے محفوظ رہنا ہے تو مادّی مقاصد کے بجائے اخلاقی مقاصد کو اپنانا اور انھیں اپنی زندگی کا نصب العین بنانا ہوگا،

محدود مقاصد

دوسری بڑی اور عام غلطی یہ ہے کہ قومیں جن مقاصد کو اپناتی ہیں ان کی افادیت ایک خاص دائرے تک محدود ہوتی ہے وہ ایک خاص قوم کے لیے تو مفید ہوتے ہیں مگر دوسری قوموں کے لیے یا تو وہ مفید نہیں ہوتے اس لیے وہ انھیں اپیل نہیں کرتے اور ان مقاصد میں وہ اس قوم کے ساتھ کوئی تعاون نہیں کرتیں اور مصائب و شدائد میں اسے تنہا چھوڑ دیتی ہیں یا وہ مقاصد دوسری قوموں کے لیے مضر اور مہلک ہوتے ہیں، اس صورت میں وہ اس کے خلاف مشتعل ہوکر اٹھ کھڑی ہوتی ہیں، اور اپنی ساری طاقت اس کو تباہ و برباد کرنے میں لگا دیتی ہیں، آج کل عام طور پر ہر قوم اپنے قومی مفاد اور قومی مقاصد کے لیے جدوجہد کرتی ہے یہ مقاصد کچھ قوموں کے خلاف پڑتے ہیں اور ان سے کشمکش شروع ہوجاتی ہے اور باقی قوموں کو ان مقاصد سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا اس لیے وہ تماشائی کی حیثیت

سے اس ہاتھا پائی کو دیکھتی رہتی ہیں، لیکن اگر کوئی قوم ساری دنیا پر چھانے کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور تمام قوموں کو دولت و اقتدار سے محروم کر کے خود اس کی مالک بننا چاہتی ہے تو پھر ساری قومیں اس کے خلاف متحد ہو جاتی ہیں اور اسے ختم کر کے ہی دم لیتی ہیں، جرمنی کے زوال کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے، اس نے صرف اس پر بس نہیں کیا کہ ترقی و کامیابی کی راہ اختیار کرے بلکہ اس نے کھلم کھلا اس بات کا اعلان کیا کہ جرمن قوم سب سے برتر ہے، اسی کو دنیا پر حکومت کرنے کا حق ہے پھر جرمن قوم انھیں عزائم کے ساتھ طوفانی انداز سے اٹھی اور اس نے واقعی دنیا پر چھانے کی پوری کوشش کی یہ حال دیکھ کر دوسری قوموں نے اس کے خلاف متحدہ محاذ بنایا اور اس کو شکست دینے کے لیے پوری قوت جنگ میں جھونک دی، نتیجہ یہ نکلا کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی بڑھتی ہوئی طاقت بالکل ختم ہو گئی اور ایک عرصے کے لیے انتہائی بے لبسی کے ساتھ مخالف قوموں کی غلام بن کر رہ گئی کمیونسٹوں کی کامیابی کا راز یہی ہے کہ وہ جس مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں وہ بظاہر سب قوموں کے لیے مفید ہے اور سب انسانوں کو نہ سہی، دنیا کے سب مزدوروں کو اپیل کرتا ہے،

پھر یہ مقاصد صرف اسی لحاظ سے محدود نہیں ہوتے کہ ان میں ایک خاص قوم کا فائدہ اور دوسروں کا نقصان یا عدم فائدہ ہوتا ہے بلکہ عموماً اس لحاظ سے بھی محدود ہوتے ہیں کہ ان میں قوم کے ایک طبقہ کا فائدہ ہوتا ہے باقی طبقے یا تو ان فوائد سے محروم رہتے ہیں جو اس خاص طبقے کو حاصل ہوتے ہیں یا پھر ان مقاصد میں کامیابی ان کے لیے مضر اور مہلک ہوتی ہے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خود قوم میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے اور کامیابی کا خواب یا تو شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتا یا کامیابی بہت جلد ناکامی میں تبدیل ہو جاتی ہے، سرمایہ دارانہ قومی جمہوریتوں کے ناکام ہونے کا سبب ایک یہ بھی ہے،

وقتی مقاصد

تیسری اہم غلطی یہ ہے کہ وقتی مقاصد کو قومی زندگی کا نصب العین بنا لیا جاتا ہے، ان مقاصد کا نام لے کر قوم کے افراد کو ایک مرکز

پر جمع کیا جاتا ہے ان کے دلوں میں انھیں وقتی مفادات کے یقین واذعان کی روح پھونکی جاتی ہے اور انھیں کے حصول کی طمع کو عمل پر ابھارنے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، لیکن یہ مقاصد بس ایک وقت تک مقاصد بنے رہتے ہیں اور اس کے بعد یا تو ان کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے یا وہ حاصل ہوجاتے ہیں اور حاصل شدہ مقاصد میں شامل ہوجانے کی وجہ سے نہ تو مرکزیت کا باعث بنتے ہیں نہ افراد کے اندر حرارت و گرمی پیدا کرتے ہیں اور نہ انھیں یقین و عمل کی قوت بخشتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم پھر بے مقصد رہ جاتی ہے اور یا تو اپیلوں اور بہانوں کے ذریعہ اس میں روح پھونکنے کی کوشش کی جاتی ہے یا ان کے لیے کچھ نئے مقاصد کی تلاش شروع ہوجاتی ہے جو مزید کشمکش کا باعث بنتی ہے، وہ تمام پارٹیاں جو چھوٹے چھوٹے اور وقتی مقاصد کے لیے روز بنتی ہیں اور ان مقاصد کا وقت گذر جانے یا ان کی اہمیت باقی نہ رہنے پر ختم ہوجاتی ہیں ان کی ناکامی کا راز یہی ہے حقیقت میں وہ کسی قوم کی بہت بڑی دشمن ہیں وہ اس کی فکر و عمل کی قوتوں کو رائگاں اور برباد کرنے والی ہیں اور اسے انتشار کی نذر کردینے والی ہیں۔

ہندوستان میں کانگریس اور مسلم لیگ کی کامیابی تما ناکامی کا راز بھی یہی ہے، کانگریس نے جس مقصد کے لیے قوم کو منظم کیا تھا اور اس کے اندر بیداری و عمل کی روح پھونکی تھی اور جس کو عظیم ترین مقصد کی حیثیت سے قوم کے سامنے پیش کیا تھا وہ آزادیٔ وطن کا نصب العین تھا، اس مقصد کو آخر کار اس نے حاصل کرلیا لیکن اب جب کہ یہ مقصد حاصل ہوگیا قوم کس مقصد کے لیے مجتمع ہو، خود کانگریس میں عمل کا وہ ولولہ کیسے باقی رہے جو آزادی حاصل نہ ہونے تک آزادی حاصل کرنے کے لیے تھا اس کا کوئی جواب کانگریس کے پاس نہیں ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں انتشار پھیل رہا ہے اور کانگریس بے عملی اور بدکرداری کی نذر ہورہی ہے، یہی حال مسلم لیگ کا ہے، مسلم لیگ نے پاکستان کے حصول کو اہم ترین مقصد کی حیثیت سے

مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اور اس کو ایمان کا ہم معنیٰ قرار دیا، مسلمانوں کی اکثریت اسے حاصل کرنے کے لیے آمادہ و تیار ہوگئی اور آخر ایک دن تقسیم ہند کی بدولت پاکستان وجود میں آگیا اور بظاہر مسلم لیگ کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا زوال بھی شروع ہو گیا، وہ پاکستان جو مقصد زندگی کی حیثیت سے اکثر مسلمانوں کے ذہن و دماغ میں رچ بس گیا تھا، اس کے لیے دوبارہ جد و جہد کرنے کا انڈین یونین میں کوئی موقع نہ رہا اور مقصدِ زندگی کے سامنے سے ہٹ جانے بلکہ ناممکن ہو جانے کی وجہ سے ان میں سخت انتشار پھیل گیا اور بدترین قسم کی مایوسی کا شکار ہو گئے، پاکستان میں بھی حصول پاکستان کا مقصد باقی نہ رہا، اور مسلم لیگ اور خود مسلمانوں کو متفق رکھنے والی کوئی چیز نہ رہی، اب یہ دونوں جماعتیں کانگریس اور مسلم لیگ اپیلوں پر اپیلیں کر رہی ہیں، اور وطن و قوم کا واسطہ دے رہی ہیں، مگر نہ قوم پر کوئی اثر ہوتا ہے اور نہ خود ان جماعتوں کے افراد پر۔

یہ بات کچھ کانگریس اور مسلم لیگ کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے اور نہ آزادی وطن اور حصول پاکستان کے نصب العین ہی خصوصیت سے ناقص ہیں، بلکہ ہر وہ مقصد جس میں اس دنیا کی کامیابی کو حاصل کرنا مطلوب ہوگا، وہ وقتی ہی ہوگا، نہ تو اس کی اہمیت ہمیشہ باقی رہ سکے گی اور نہ وہ کسی قوم کا مقصد دائمی ہی بن سکے گا، قوم ایک نہ ایک دن اسے حاصل کرے گی، اور اس کے اس مقصد میں کوئی کشش اور جاذبیت باقی نہ رہے گی، ایسے موقعوں پر عام طور سے یہ تدبیر عمل میں لائی جاتی ہے کہ اس حاصل شدہ مقصد کو باقی اور محفوظ رکھنے کا داعیہ لوگوں میں پیدا کیا جاتا ہے اور اس طرح قوم کے انتشار اور اس کی بے عملی و بے یقینی کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن یہ تدبیر ناکام رہتی ہے اور عام انسانوں کا رجحان اس مقصد کی طرف باقی نہیں رہتا، یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جتنی جد و جہد کرتا ہے اتنی جد و جہد اسے باقی اور محفوظ رکھنے کے لیے

نہیں کر پاتا، انسان پر محسوسات کا بڑا اثر پڑتا ہے جب تک اسے یہ مقصد حاصل نہیں ہو جاتا وہ خلا محسوس کرتا ہے اور بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار کرتا ہے مقصد کے حاصل ہو جانے کے بعد اس کا یہ اضطراب سکون سے تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ بے فکر و بے غم ہو جاتا ہے اب لاکھ سمجھائیے کہ یہ غفلت اس مقصد کے لیے مہلک ہے اور وہ حاصل شدہ نعمت کے کھو جانے کا باعث ہوگی مگر چونکہ وہ اس نعمت کو موجود پاتا ہے اور خطرہ صرف ذہنی و خیالی ہوتا ہے اس لیے اس کے احساسات شدت کے ساتھ نہیں ابھرتے اور وہ بدستور اپنی دوسری محسوسات میں محو رہتا ہے، یہاں تک کہ ایک دن وہ آتا ہے کہ اس مقصد کی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی اور اسے معمولی معمولی فوائد کے لیے قربان کر دیا جاتا ہے۔

غلط طریق کار

چوتھی بڑی خام کاری یہ ہے کہ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جس طریق کار کو موزوں خیال کیا جاتا ہے وہ صحیح اور موزوں نہیں ہوتا، شروع شروع میں یہ بات محسوس نہیں ہونے پاتی، تحریک پورے زور شور اور جوش و خروش کے ساتھ چلتی رہتی ہے اور ہر طرف کامیابی قدم چومتی دکھائی دیتی ہے کہ اچانک سارا نقشہ پلٹ جاتا ہے اور قوم ناکامی کے مہیب غار میں جا گرتی ہے اس وقت اندازہ ہوتا ہے کہ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا وہ صحیح نہ تھا یا کم از کم اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ حاصل شدہ مقصد کو قائم و برقرار رکھتا، درحقیقت اس کا اندازہ کرنا ہے بھی بہت مشکل کہ کونسا طریقہ کار کسی قوم کی فلاح و بہبود کا یقینی ذریعہ ہو سکتا ہے، افراد چھوٹے موٹے کام کرنا چاہتے ہیں جن میں دوسرے افراد سے کوئی خاص تصادم پیش نہیں آتا اور جن کے لیے وہ کافی سوچ بچار کر کے کوئی راہ عمل اختیار کرتے ہیں ان میں بھی کبھی وہ کامیاب ہوتے ہیں اور کبھی انتہائی کوششوں کے باوجود ناکام ہی رہتے ہیں۔ قومی و اجتماعی کوششوں کا معاملہ بالکل دوسرا ہے ان کے لیے بڑی احتیاط و تدبر

کی ضرورت ہے، کل دنیا کا حال کیا ہوگا، سیاسی و معاشی حالات کیا پلٹا کھائیں گے قوموں کا رویہ کیا کچھ ہوگا، اور ان سب کے وسیع اثرات کیا ہوں گے، اور ان سب کے لیے کون سا طریقۂ کار موزوں اور برمحل ہوگا، یہ معلوم کرنا کتنا دشوار ہے؟ پھر افراد کی طرح قوموں کو اتنا موقع نہیں ہوتا کہ وہ بار بار نئے تجربے کر سکیں اور ایک طریقہ کار کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ کار اختیار کر سکیں، کسی قوم کے لیے ترقی و کامیابی کی راہیں ہر دم یکساں کھلی نہیں رہتی، ہر بار کی کشمکش اور مسابقت حالات کو کہیں سے پہنچا دیتی ہے، صرف یہی نہیں ہوتا کہ قوم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوتی، اس سے کہیں بڑی مصیبت یہ آپڑتی ہے کہ وہ ذہنی، عملی، اخلاقی و مادی قوتوں کے لحاظ سے دیوالیہ ہوجاتی ہے اس کے پاس قوتوں کا اتنا بڑا سرمایہ بچتا ہی نہیں کہ اسے لے کر پھر کسی دوسرے طریقہ کار کو آزمائے اور ہاری ہوئی بازی کو جیت لے، پھر اس ناکامی کی بدولت وہ مخالف طاقتوں کی غلام ہوجاتی ہے جو اس کے ابھرنے کے سارے امکانات کو ایک ایک کرکے ختم کر دینے کی پوری کوشش کرتی ہیں اور اسے فنا کے گھاٹ اتار دینے کی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتیں۔

توڑ پھوڑ

پانچویں بڑی مہلک غلطی یہ ہے کہ قومیں اپنے عروج و ارتقاء کے لیے جو طریقے اختیار کرتی ہیں ان میں اس بات کا خیال بہت کم رکھتی ہیں کہ وہ توڑ پھوڑ، تخریب و فساد اور حیوانیت و درندگی سے خالی ہوں، وہ ان راستوں پر نہیں چلتیں جن میں کامیابی دیر میں ملتی ہے مگر جن کی وجہ سے دنیا کا امن و سکون غارت نہیں ہوتا، اور اخلاق و انسانیت کی تباہی عمل میں نہیں آتی، وہ ان راستوں کو پسند کرتی ہیں جن کے متعلق ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ ان پر چل کر کامیابی جلد حاصل ہو سکے گی، یہ راستے فساد و خونریزی اور ہلاکت و بربادی کے راستے ہوتے ہیں، ان راہوں پر جب کوئی قوم چل کھڑی ہوتی ہے تو دوسری قومیں اس کی مخالفت کے لیے کمربستہ ہوجاتی ہیں، اور اس طرحِ قومی عزائم کے پورے ہونے میں جو رکاوٹیں ہوتی ہیں وہ تو ہوتی

ہی ہیں دنیا فساد وخونریزی کا جہنم بن جاتی ہے انسانوں کی صلاحتیں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر ختم ہوتی ہیں اور زمین کے ذرائع و وسائل وسیع پیمانہ پر جنگ کی ہولناکیوں کی نذر ہوتے ہیں اور اس سے جو سیاسی، معاشی اور مادی بحران پیدا ہوتا ہے اور عرصۂ دراز تک چلتا رہتا ہے اس سے دوسری قوموں کی طرح وہ قوم یا جماعت بھی حصہ پاتی ہے جس نے اپنے مقصد کے لیے انسانیت سوز طریقے اختیار کئے تھے ان غلطیوں سے اگر ہم محفوظ رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں دو باتوں کا سختی کے ساتھ لحاظ رکھنا ہوگا،

۱۔ ہم صرف اس مقصد کو اپنا نصب العین بنائیں جو صحیح ہو، اخلاقی ہو۔ کسی خاص طبقے یا قوم کے بجائے سب انسانوں کے لیے مفید ہو۔ وقتی اور ہنگامی ہونے کے بجائے دائمی وابدی ہو، اس دنیا کی کامیابی تک محدود ہونے کے بجائے وسیع تر ہو۔

۲۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ طریقہ کار ہم اختیار کریں جو صحیح ہو، اس مقصد کو حاصل کرنے اور باقی رکھنے کا باعث ہو، اور اس میں جنگ وتخریب کی صرف اتنی ہی گنجائش ہو جتنی مجبورکن حالات میں ناگزیر ہوتی ہے۔

لیکن اس راہ کی سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ اس کا دریافت کرنا انسان کے بس سے باہر ہے، دنیا کی موجودہ اور آئندہ انسانی نسلوں کی دائمی فلاح وبہبود کے لیے ایسا نصب العین طے کرنا جو اس دنیا کی کامیابی تک محدود نہ ہو اور اس کے لیے صحیح طریق کار متعین کرنا اسی وقت ممکن ہے جب کہ سب انسان مجتمع ہو کر اس مسئلے پر عرصۂ دراز تک پوری سنجیدگی وہ یکسوئی وخلوص کے ساتھ غور کریں ان کے پاس گذشتہ اور موجودہ زمانے کی تمام معلومات ہوں اور وہ ان سے صحیح صحیح فائدہ اٹھائیں، انھیں آئندہ ہونے والے واقعات وحالات اور آئندہ پیدا ہونے والے انسانوں کے رجحانات وضروریات کا صحیح علم ہو اور ان سب کا وہ پوری دیانتداری سے لحاظ کریں، اس کے ساتھ ساتھ انھیں یہ بھی معلوم ہو کہ اس دنیا کے بعد کیا ہوگا اس میں کامیابی و

ناکامی حاصل کرنے کے طریقے کیا ہیں اور اس کی کامیابی کو وہ اپنے پیش نظر رکھیں اور ان سب باتوں کو پوری سنجیدگی و ہوشمندی سے ملحوظ رکھنے کے بعد وہ کسی ایک نتیجہ پر پہنچیں، اس طرح اور صرف اسی طرح یہ عقدہ حل ہو سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ امور انسان کے اختیار میں نہیں ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ کوئی شخص مخصوص حالات و رجحانات کے ماتحت کسی خاص نظریہ کو اپنے ذہن و دماغ میں جگہ دے دیتا ہے، پھر اس نظریہ کی حمایت میں تحریر و تقریر کے ذرائع استعمال کرتا ہے، قوم رفتہ رفتہ پروپیگنڈے کے اثر سے نیم شعوری حالت میں اس نظریہ کو اپنا لیتی ہے حالات کے ماتحت اس کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ کار بھی اختیار کر لیا جاتا ہے اور اس طرح قومی و اجتماعی مقاصد جیسے اہم اور نازک مقاصد کے لیے جدّوجہد کی مہم شروع ہو جاتی ہے، اس ساری تگ و دو غور و فکر اور سنجیدگی و ہوش مندی کا عنصر افسوس ناک حد تک کم ہوتا ہے، جذباتیت اشتعال اور ہنگامہ آرائی کے عناصر بری طرح چھائے رہتے ہیں، کیا سوچنے اور عمل کرنے کا یہ طریقہ نوعِ انسانی یا کسی خاص قوم کی حقیقی کامیابی و ترقی کا ضامن ہو سکتا ہے اور کیا اس طرح انسانی گتھیوں کو کبھی بھی حل کیا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا ہوتا تو آج کے مدبرین انسانیت کی تباہی کا باعث نہ ہوتے اور لیگ آف نیشنز اور یو۔این۔او کی کوششوں سے الجھے ہوئے مسائل میں الجھاؤ کا اور اضافہ نہ ہوتا،

سوال یہ ہے کہ پھر نوعِ انسانی کیا کرے؟ کیا وہ غلط مقاصد کے پیچھے یوں ہی اپنی صلاحیتوں کو کھپاتی رہے؟ کیا غلط سلط طریقوں کو یوں ہی آزما آزما کر چھوڑتی رہے اور پھر نئے نئے غلط طریقے اختیار کرتی رہے؟ کیا اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس کے لیے روشنی کی کوئی کرن نہیں ہے؟ کیا انسان کو اپنے آپ سے، اپنی انسانیت سے اور اس دنیا سے مایوس ہو جانا چاہیے؟ کیا زمین کو یوں ہی جہنم زار بننے دینا چاہیے؟

اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر روشنی کی کرن کہاں سے آتے، ہدایت و رہنمائی کس سے ملے؟ مقصد اور طریق کار کون بتائے؟

اس منزل پر پہنچنے کے بعد آپ کو کچھ زیادہ غور و فکر سے کام نہ لینا پڑے گا، آپ اس حقیقت کو ماننے پر اپنے آپ کو مجبور پائیں گے کہ یہ کام صرف اس خدا کا ہے جو اس کائنات کا خالق ہے جو اس کائنات کی ہر چیز کو پیدا کرتا، اسے زندگی کی قوتیں بخشتا اور ان قوتوں کو کام میں لانے کے طریقے بتاتا ہے: اَلَّذِیْٓ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی، جس نے ہر چیز کو اس کا وجود بخشا پھر اس کی رہنمائی کی" اسی نے انسان کو پیدا کیا ہے اسی نے انسان کو مختلف قوتیں اور صلاحیتیں بخشی ہیں، اس نے تمام دنیا کے ذرائع و وسائل اور انسان کی تمام ضرورتیں پیدا کی ہیں، اس لیے یہ اسی کا کام ہے کہ وہ اہم ترین مسئلے میں انسان کی رہنمائی کرے، جس میں خود انسان کی عقل عاجز ہے جب کہ وہ انسان کی تمام دوسری ضرورتیں پوری کرتا ہے اور جب کہ زندگی بخشنا اور اس کو ختم کر دینا اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ کون سے اسباب و ذرائع انسان کے لیے زندگی بخش ہیں اور کون سے اس کے لیے مہلک و تباہ کن، بلکہ وہ اسباب و ذرائع اسی کے پیدا کردہ ہیں، پھر اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا بھی وہ مالک ہے اور اس کی کامیابی و ناکامی بھی اسی کے ہاتھ میں ہے حضرت ابراہیم فرماتے ہیں۔

الَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ ﴿۷۸﴾ وَالَّذِیْ هُوَ
یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ﴿۷۹﴾ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ
یَشْفِیْنِ ﴿۸۰﴾ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ ﴿۸۱﴾
وَالَّذِیْٓ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ
الدِّیْنِ ﴿۸۲﴾

جس نے مجھے پیدا کیا ہے وہی مجھے ہدایت دے گا، جو مجھے کھلاتا ہے اور پلاتا ہے، اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے، اور جو مجھے موت دے گا اور پھر زندہ کرے گا، اور جس سے مجھے توقع ہے کہ جزا کے دن وہ میری لغزشوں کو معاف فرما دے گا۔ شعراء (۷۸ تا ۸۲)

اسی کا علم ساری کائنات پر حاوی ہے، وہی جانتا ہے کہ ماضی میں کیا کچھ ہو گذرا ہے، حال میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور مستقبل میں کیا ہوگا، وہی انسان کی فطرت کو بھی جانتا ہے جس پر اس نے انھیں پیدا کیا ہے۔ حکمت و دانائی کا سرچشمہ وہی ہے اس لیے کامیابی و کامرانی کی صحیح راہ کی نشان دہی اس سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا۔

اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾ (طٰہٰ-۹۸)

تمہارا معبود وہی اللہ ہے جس کے سوا نہیں اور جس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔

قرآن اسی حکیم و علیم خدا کا نازل کردہ ہے۔

وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِیْمٍ عَلِیْمٍ ۝ (بنی اسرائیل-۹)

اور بے شک آپ پر قرآن حکیم و علیم خدا کی جانب سے القاء کیا جاتا ہے۔

اور اسی لیے نازل کیا گیا ہے کہ انسان کو صحیح رہنمائی بخشے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ النمل (۶)

بے شک یہ قرآن اس طریق زندگی کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو بالکل صحیح اور سیدھا ہے

یہی وہ روشنی ہے جو زندگی کے ہر ہر موڑ پر سلامتی کے راستے کی نشان دہی کرتی ہے، ہر طرح کی تاریکیوں سے انسان کو نکال کر کھلے دن کے اجالے میں لے آتی ہے اور انسانی زندگی کو صحیح معنٰی میں کامیاب و بامراد کرتی ہے، قرآن نے شروع ہی میں اس بات کو واضح کر دیا کہ جو اسے مانتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

یہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

اس نے بار بار اس حقیقت کا اعلان کیا ہے کہ۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ

بے شک تمہارے پاس اللہ کی جانب سے

كِتٰبٌ مُّبِينٌ ﴿۱۵﴾ يَّهْدِىْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَ يَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۶﴾

نور اور واضح کتاب آئی ہے اس کے ذریعہ اللہ ان لوگوں کو سلامتی کی راہوں پر چلنے کی توفیق دیتا ہے جو اس کی رضا کے پیچھے چلتے ہیں اور انھیں تاریکیوں سے نکال کر اپنے اذن سے روشنی میں لے آتا ہے اور صراط مستقیم کی طرف ان کی رہبری کرتا ہے

اس لیے آیئے قرآن سے اس عقدۂ لاینحل کو حل کرنے کی کوشش کریں، اس سے قبل کہ ہم قرآن کی طرف اس سلسلہ میں رجوع کریں بہتر ہے کہ قوموں کے عروج وزوال کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ایک بار پھر نظر ڈال لیں۔ اس کا خلاصہ اگر کیا جائے تو وہ حسب ذیل ہوگا۔

۱۔ قوموں کا عروج وزوال کوئی اتفاقی چیز نہیں اس کے پیچھے اسباب وعلل کارفرما ہوتے ہیں۔

۲۔ قوموں کا عروج وزوال مادّی طاقت کے بجائے اخلاقی طاقت کی کمی بیشی کی بنا پر ہوتا ہے۔

۳۔ قوموں کے عروج کے لیے ضروری اخلاقی صفات چند ہیں۔

(۱) مقصد زندگی متعین ہو، ہر ہر فرد کے دل میں اس کا یقین ہو۔ وہ مقصد دنیا کے سارے مقاصد سے زیادہ عزیز ومحبوب ہو۔

۲۔ مقصد کے مطابق عمل کرنے کا ولولہ ہو۔

۳۔ یقین وعمل کے سلسلہ میں ایک دوسرے کی نگہداشت تعلیم وتربیت، اور تبلیغ ودعوت کا انتظام ہو۔

۴۔ مقصد پر یقین، عمل اور تبلیغ ودعوت کے لیے صبر واستقامت کو اختیار کیا جائے۔

۵- جو مقصد اپنایا جائے وہ صحیح ہو۔ غیر مادی یعنی اخلاقی ہو، دائمی و عالم گیر ہو، جو ہر انسان کا مقصد زندگی بن سکے، اور جو اس دنیا کی کامیابی تک محدود نہ ہو۔

۶- اس کے لیے جو طریقہ کار اختیار کیا جائے وہ صحیح ہو، یقینی ہو۔ دنیا کے امن و امان کے قائم کرنے کا باعث ہو۔ اس کو برباد کرنے کا موجب نہ ہو۔

ان مسائل کو سامنے رکھ کر آپ قرآن پر نظر ڈالیں گے تو اس کا ہر ہر لفظ آپ کے لیے ہدایت و رہنمائی ثابت ہوگا۔ آپ پائیں گے کہ قرآن اقوام کے عروج و زوال کے واقعات کو بیان کرنے والی سب سے مستند کتاب ہے آپ اس میں مختلف اقوام کے ارتقاء اور تنزل کی داستانیں کثرت سے اور ہر ہر صفحہ پر پائیں گے، اس میں انتہائی وضاحت کے ساتھ اس حقیقت پر اصرار کیا گیا ہے اور واقعات و شواہد اور دلائل و براہین سے ثابت و مبرہن کیا گیا ہے کہ اس کائنات میں کوئی چیز اتفاقی نہیں ہوتی، ہر ہر چیز کے پیچھے حکمت و دانائی کام کرتی ہوتی ہے دنیا کا کوئی انقلاب یوں ہی نہیں ہو جاتا اس کے پیچھے اسباب و علل ہوتے ہیں، قوموں کی ترقی و تنزل بھی نہ اتفاقی ہے نہ مادی طاقت کا نتیجہ بلکہ اس کے لیے مستقل اخلاقی قوانین ہیں، اس کی ہر ہر آیت میں واضح ہی یہ کیا گیا ہے کہ انسان کا مقصد زندگی کیا ہے اس میں ان لوگوں کی بڑی مذمت کی گئی ہے جو سوچ سمجھ کر اپنی زندگی کا مقصد متعین نہیں کرتے اور انھیں چوپایوں سے بھی بدتر گردانا گیا ہے، اس میں منافقین کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ شک و ارتیاب کی کیفیت جب دل میں موجود ہوتی ہے تو انسان دنیا میں کوئی عملی جدوجہد کر نہیں پاتا اس میں بہت صاف الفاظ میں اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ صرف ایمان و یقین سے کام نہیں چلتا یقین کے ساتھ عمل کا ہونا ضروری ہے بلکہ یقین کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ عمل پیدا ہو، اس نے پچھلی قوموں کے بگڑنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے اندر دعوت و تبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی

عن المنکر کا نظم باقی نہ رہا تھا۔ اور اس نے "اُمتِ مسلمہ" کا دائمی مقصد وجود بتایا ہی یہ ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی عالم گیر ذمے دار بنے، اس نے فتح ونصرت اور کامیابی وکامرانی کے لیے صبر واستقامت کو ایک اٹل اصول کی حیثیت دی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کی امداد انھیں کے ساتھ ہے جو صبر واستقامت کی راہ اختیار کرتے ہیں، یہ سب باتیں قرآن نے بہت تفصیل سے بتائی ہیں اور کوئی شخص جس کی قرآن پر کچھ بھی نظر ہو ان کا انکار نہیں کر سکتا اب آیئے مقصد اور طریق کار کے تعین میں قرآن سے مدد لیں،

حیاتِ انسانی کا مقصد

انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس سوال کا صحیح جواب اس وقت معلوم ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ خالق کائنات نے ہمیں کس لیے پیدا کیا ہے، اس کائنات میں جس میں ہم رہتے ہیں اور جس کا ہم ایک بہت ہی چھوٹا جزو ہیں ہمارا مقام کیا ہے، اور یہ کائنات بحیثیت مجموعی کس منزلِ مقصود کی طرف جارہی ہے اور کس قسم کے قوانین کے زیر اثر چل رہی ہے، قرآن مجید ان سب باتوں کا تسلی بخش جواب دیتا ہے۔

وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا (رعد)

اللہ ہی کے (احکام کے) آگے سجدہ ریز ہوتی ہیں وہ تمام مخلوقات جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں چار وناچار۔

وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّالْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ (نحل)

اللہ ہی کے (احکام کے) آگے سجدہ ریز ہوتی ہیں وہ تمام چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور وہ تمام مخلوقات جو زمین پر چلتی ہیں اور فرشتے اور یہ اس کے آگے سجدہ ریز ہونے سے سرکشی اختیار نہیں کرتے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ پوری کائنات اللہ کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت کر رہی ہے، اس کے سوا اس کا کوئی اور کام نہیں ہے اور نہ اس میں یہ طاقت ہے کہ اس فریضے کی ادائے گی سے انحراف کر سکے، یہ ایک ایسی بات ہے جو آج کے دور میں دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے، جس شخص کو بھی کائنات کا کچھ علم ہے اور جو بھی سائنس کی تحقیقات پر نظر رکھتا ہے وہ اس حقیقت کو جانے اور مانے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پوری کائنات انتہائی مضبوطی اور قوت کے ساتھ فطری قوانین میں جکڑی ہوئی ہوئی ہے، ان فطری قوانین کا دائرۂ اقتدار حقیر سے حقیر ذرے سے لے کر کائنات کی عظیم سے عظیم مخلوق کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہیں اور ہزاروں سال سے یہ کائنات اسی طرح چل رہی ہے کہ کسی چھوٹی بڑی چیز نے ان قوانین سے سرِ مو بھی کبھی انحراف نہیں کیا اور نہ کائنات کے مستحکم، مربوط اور وسیع نظام کو دیکھتے ہوئے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ایسا کبھی ہو سکے گا، پھر اس کائنات کی تمام چیزوں کا غیر مختتم فریضہ ہے ہی یہی کہ وہ ان قوانین پر مسلسل رہیں، اس کے علاوہ ان کا کوئی کام نہیں۔ اب اگر اس کائنات کا ایک خالق ہے۔ اور خالق کے بغیر دنیا کی تخلیق ممکن کیسے ہے۔ تو یہ فطری قوانین لامحالہ اس کے وضع کیے ہوئے ہوں گے، کیوں کہ وہ نظام جو پوری کائنات پر چھایا ہوا ہو، جو ہر ہر چیز کے لیے اپنا الگ الگ ضابطہ اور قاعدہ رکھتا ہو اور جو انتہائی ژرف نگاہی، دانشمندی، اور ارتقاء کا حامل ہو اور جو پوری قوت کے ساتھ اس کائنات میں نافذ ہو، کسی حکیم و علیم اور وسیع النظر واضع قانون کے بنائے بغیر وجود میں نہیں آسکتا اور نہ کسی ایسی ہستی کے نافذ کیے بغیر نافذ ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ میں کل کائنات کا انتظام ہو، جس کی طاقت سب سے زبردست اور سب پر حاوی ہو اور جس کی اطاعت سے انحراف کی مجال کسی میں نہ ہو، ظاہر ہے کہ ایسی ذات صرف خالق کائنات کی ہو سکتی ہے اس لیے دوسرے الفاظ میں ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس کائنات میں اللہ کے قوانین

جاری و نافذ ہیں اور یہ کائنات ساری کی ساری ہر دم اس کی اطاعت و بندگی میں لگی ہوئی ہے۔

پھر انسان کا مقام کیا ہے؟

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾

کیا یہ لوگ اللہ کے ضابطے کے مطابق کسی اور ضابطے کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں حالانکہ آسمان اور زمین میں جتنی بھی مخلوقات ہیں سب نے چار و ناچار اسی کی اطاعت قبول کی ہے اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

کتنی صاف اور روشن حقیقت ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ کائنات اپنے تمام اجزا سمیت ان قوانین کی پوری اطاعت کر رہی ہے جو خدا نے اس کے لیے وضع کر دیئے اور نافذ کر دیئے ہیں انسان اس کائنات کا ایک جزو ہے اس کی زندگی اور موت اور سارے مسائل اس کائنات اور اس کے مسائل کے ساتھ وابستہ ہیں، پھر یہ پوری کائنات ایک وحدت (UNIT) ہے اور اس میں وہی چیز پنپ سکتی اور ارتقا کر سکتی ہے جو اس پورے نظام کے ساتھ توافق رکھتی ہو۔ پھر خدا اس کائنات کی طرح انسان کا بھی خالق و مالک اور آقا ہے ان سب حقائق کی روشنی میں یہی بات حق اور درست بھی ہے کہ انسان کائنات کی طرح اللہ کی بندگی اور اس کے بھیجے ہوئے ضابطے کی اطاعت کرے، اور اسی میں اس کی فلاح و بہبود اور اس کا نفع اور ارتقا بھی ہے کہ وہ اور کائنات ایک ہی منزل کے لیے سرگرم سفر ہوں، اور یہ سب ایک ہی کارواں ہو جس میں باہم تعاون ہو، توافق ہو اور اتحاد ہو، ورنہ انسانی زندگی کا کائنات کے قوانین سے ٹکراؤ ہوگا اور آپ جانتے ہیں کائنات کا نظام تو اپنی جگہ پر رہے گا البتہ انسانی زندگی کا شیرازہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا، انسان کا تو یہ حال ہے کہ وہ کائنات کے کسی ایک قانون کو بھی نہیں توڑ سکتا اور

کسی ایک ضابطے کی بھی خلاف ورزی کر کے تباہی و بربادی سے نہیں بچ سکتا چہ جائے کہ پورے نظام کائنات اور اس کے بنیادی اصولوں سے اس کا ٹکراؤ ہو اور پھر وہ سلامتی کی امید رکھے، یہی بات ہے جو ان آیات میں فرمائی گئی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ یَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِی الْاَرْضِ وَ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ وَ النُّجُوْمُ وَ الْجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَ الدَّوَآبُّ وَ كَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ؕ وَ كَثِیْرٌ حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ ؕ وَ مَنْ یُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ (حج)

(اے انسان) کیا تو نے غور نہیں کیا کہ اللہ ہی کے (احکام کے) آگے سجدہ ریز ہوتی ہیں وہ تمام مخلوقات جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج چاند تارے پہاڑ، درخت، حیوانات، اور بہت سے انسان۔ اور بہت سے انسان ایسے بھی ہیں جو (اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے) عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں اور جسے اللہ ذلیل و رسوا کر دے اسے کوئی عزّت بخشنے والا نہیں ہے۔

یعنی جو لوگ فرماں روائے کائنات کے احکام اور نظام کائنات کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ لا محالہ عذابِ الٰہی کے مستحق ہو جاتے ہیں اور ایک ایسی ذلت و خواری کا شکار ہو جاتے ہیں جس سے کوئی نکالنے والا نہیں ہوتا۔

ایک دوسری آیت میں انسان کے مقصدِ وجود کو اور بھی واضح الفاظ میں بتایا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾

میں نے جن اور انسان کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔

کائنات سے انسان کا تعلق کیا ہے؟ اسے واضح کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ رَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ ؕ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖ٭ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۶۵﴾ (انعام)

وہ خدا ہے جس نے تمہیں زمین میں اپنا نائب با اقتدار بنایا اور تم میں سے بعض کے درجے بعض سے بلند کئے تاکہ اس نے جو کچھ تمہیں بخشا ہے اس میں تمہیں آزمائے، بے شک آپ کا رب جلد عذاب دینے والا ہے اور یقیناً وہ بہت درگذر کرنے والا اور بہت مہربان ہے۔

دیکھیے قرآن نے کتنے صحیح اور جچے تلے الفاظ میں کائنات سے انسان کے تعلق کو واضح کیا ہے، یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں وہ اس کائنات کا ایک چھوٹا سا جزو ہے، اس زمین پر جتنی مخلوق رہتی ہے اس میں انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جسے سوچنے سمجھنے کی قوت اور رائے اور عمل کی آزادی حاصل ہے اور جس کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ زمین کے سارے ذخائر، تمام چیزوں اور ہر ایک قوت سے فائدہ اٹھائے اور ان کو جس طرح چاہے استعمال کرے، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انسان کو زمین پر اور اس کی چیزوں پر اقتدار حاصل ہے اور جب اس کائنات کا ایک فرماں رواں ہے اور اسی کے قانون کے مطابق زمین کا انتظام ہو رہا ہے اور انسان کو اسی نے پیدا کیا ہے اور انسان کو یہ صلاحیت بھی اسی نے بخشی ہے کہ وہ زمین پر با اقتدار بن کر رہے تو یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان اللہ کا نائب ہے اور اس کی آزادی اور اس کے اقتدار کا مصرف اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ کی بندگی کرے اور زمین کی چیزوں سے اس طرح فائدہ اٹھائے جس طرح اللہ کا قانون اس کی رہنمائی کرے، ظاہر ہے کہ اس کائنات میں جس میں ایک لاشریک اور عزیز و قدیر فرماں روا کی فرماں روائی پوری ہمہ گیری کے ساتھ چل رہی ہے کسی مخلوق کی محدود آزادی کے یہ معنیٰ کسی طرح نہیں ہو سکتے کہ اسے خود مختاری کا حق حاصل ہے، نہیں اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس مخلوق کا امتحان لیا جا رہا ہے

کہ وہ آزادی کی اس مہلت کو فرماں روائے کائنات کی بندگی کرنے میں صرف کرتی ہے یا اس کی بغاوت و نافرمانی میں پہلی صورت میں یہ امید کی جاتی ہے کہ کائنات اس کو اپنی مزید نعمتوں سے نوازے گا، اور دوسری صورت میں اس کے سوا اور انجام کیا ہوسکتا ہے کہ وہ مخلوق تباہ و برباد ہو اور اللہ کے عذاب کی مستحق ہو۔

اللہ کی بندگی اللہ کے قانون کی اطاعت ہی کے ذریعہ ہوسکتی ہے اور اللہ کا قانون کہاں سے ملے گا؟ اس کی وضاحت اسی وقت کر دی گئی تھی۔ جب پہلے انسان کو زمین پر خلیفہ بنا کر بھیجا گیا تھا اور نوع انسانی کے زمین پر بسنے اور رہنے سہنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ (بقرہ)

ہم نے (آدم و حوا سے) کہا تم سب یہاں سے اتر کر زمین پر جاؤ، پس اگر تمہارے پاس میری جانب سے ہدایت آئے تو جو لوگ اس ہدایت کی پیروی کریں گے انھیں (آخرت میں) نہ خوف ہوگا نہ کسی قسم کا غم لاحق ہوگا اور جو ہماری آیات کا انکار کریں گے اور انھیں جھٹلائیں گے وہ دوزخ کے مستحق ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

دوسری جگہ ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ ۙ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۵﴾ (اعراف)

اے اولاد آدم! اگر تمہارے پاس خود تم میں سے رسول آئیں جو میرے احکام تم سے بیان کریں تو تم میں سے جو شخص تقوی اختیار کرے اور اپنے رویے کو درست بنا لے تو ایسے لوگوں

کو نہ خوف لاحق ہوگا اور نہ وغمگین ہوں گے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ خدا کی جانب سے انسان کی رہنمائی کے لیے جو ہدایت آئے گی وہ کچھ منتخب انسانوں کے ذریعہ آئے گی جنھیں اللہ اپنا پیغام پہنچانے کے لیے چن لے گا اور جنھیں قرآن کی اصطلاح میں نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْهَا نَذِیْرٌ (فاطر ۲۴) — کوئی بھی قوم ایسی نہیں جس میں اللہ کی طرف سے ہشیار کرنے والا نہ گذرا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ نے اپنے اس وعدہ کو پورا فرمایا اور انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنی کتابیں اور اپنے رسول بھیجے۔ خود انسانی تاریخ اس کی شاہد ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں وہ سب انسانوں کے لیے قیامت تک رسول ہیں۔

مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَ لٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ (فاطر ۴۴) — محمد تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں بلکہ اللہ کے رسول ہیں اور سب سے آخری نبی ہیں۔

اور قرآن میں اس نظام زندگی کی تکمیل کر دی گئی ہے جو ابتدائے آفرینش سے انسان کی رہنمائی کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ) — آج کے دن میں نے تمہارا دین (نظام زندگی) تمہارے لیے مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو ایک نظام زندگی کی حثیت سے پسند کیا۔

تو اب اللہ کی بندگی کے لیے ضروری ہے کہ انسان اس قانون زندگی

کو واجب الاتباع سمجھے جو قرآن میں موجود ہے اور جس کا عملی نمونہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی سے پیش کیا ہے۔

اور یہ کس لیے؟ تاکہ انسان اللہ کے امتحان میں کامیاب ہو اور دوسری زندگی کی دائمی وجاودانی آسائش وانعام کا مستحق ہو اور اس ابدی عذاب سے بچے جسے اللہ نے اپنے باغیوں کے لیے تیار کیا ہے۔

اس وقت تک کی ساری تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر ہر انسان کا، ہر قوم کا اور پوری نوعِ انسانی کا مقصد وجود یہ ہے کہ اللہ کی بندگی اس کے بھیجے ہوئے دستور حیات کی اطاعت کے ذریعے کی جائے تاکہ آخروی زندگی کامیاب ہو اور آخرت کی تلخ کامیوں سے نجات حاصل ہو۔

اس سے قبل مقصد کے سلسلے میں جو کچھ بنیادی باتیں طے ہو چکی ہیں ان کی کسوٹی پر اس مقصد کو پرکھ کر دیکھ بھی لیجئے۔ سب سے پہلی بات یہ تھی کہ مقصد صحیح ہو اور فطری ہو۔ آپ خود اندازہ فرما سکتے ہیں کہ انسان کا صحیح اور فطری مقصد وجود اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ انسان اللہ کی بندگی اور اس کے قانون کی پیروی کرے، آپ جان چکے ہیں کہ کائنات کی ہر ہر چیز اسی مقصد کو حاصل کرنے مین سرگرم سفر ہے اور اسی میں اس کا ارتقاء ہے آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ انسان اپنی زندگی کے طبعی حصہ میں جو بھی ارتقاء کرتا ہے وہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے طبعی قوانین کی پیروی کرتے ہوئے ہی کرتا ہے اور اس پر اس کی زندگی اور اس کی تمام راحتوں کا دارومدار ہے تو پھر اخلاقی وتمدنی زندگی میں اللہ کی بندگی صحیح اور فطری کیوں نہ ہو گی اور اللہ کی دی ہوئی زندگی وآزادی کا یہ مقصد بھی اگر صحیح اور فطری نہیں ہے تو پھر کون سا مقصد صحیح اور فطری ہو گا،

دوسری بات یہ تھی کہ وہ مقصد مادّی نہ ہو، ظاہر ہے کہ یہ مقصد قطعاً غیر

مادّی ہے اللہ اس کائنات سے ماوراء ہے، اس کے جس قانون کی پیروی مطلوب ہے وہ اخلاقی ہے اور جس دنیا کی کامیابی مقصود ہے وہ اس دنیا کے علاوہ دوسری دنیا ہے

تیسری بات یہ تھی کہ اس مقصد کی افادیت نہ کسی قوم تک محدود ہو نہ کسی طبقے اور کسی زمانے تک بلکہ وہ سب انسانوں کے لیے اور سب طبقوں کے لیے یکساں مفید ہو، اور رہتی دنیا تک اس کی افادیت رہے اللہ کی بندگی ظاہر ہے کہ سب انسانوں ہی کے لیے مفید ہے اور رہتی دنیا تک مفید ہے، اللہ رب العالمین ہے، اس کا کسی انسان سے کوئی خاص تعلق نہیں، وہ سب کا پیدا کرنے والا، سب پر مہربان، سب کا پروردگار، سب کا شہنشاہ اور سب کا الٰہ ہے، اس لیے اس کا قانون سب کے لیے مفید ہے جس طرح اس کا طبعی قانون پوری کائنات کے لیے اور سب انسانوں کے لیے یکساں مفید ہے، جس خدا نے ہمارے لیے یہ نظام حیات بھیجا ہے وہ اگر رب الناس، ملک النّاسؔ الٰہ النّاس ہے تو جو رسول اسے لے کر آئے ہیں وہ رحمتہ للعالمین ہیں جن کا بہت واضح فرمان یہ ہے۔

لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِاَبْیَضَ عَلٰی اَسْوَدَ اِلَّا بِالدِّیْنِ اَوْ تَقْوٰی ۔ کُلُّکُمْ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔

کسی عربی کو کسی عجمی پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر دین و تقوی کے علاوہ کوئی فضیلت نہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے تھے۔

اور جو کتاب آپ لائے ہیں وہ ھُدًی لِّلنَّاسِ یعنی سب انسانوں کے لیے ہدایت ہے، اور اسلامی نظام زندگی کا حقیقی مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ وہ واقعی پوری نوع انسانی کو سامنے رکھ کر ان کی زندگی کے مسائل کو حل کرنے، انھیں آخرت میں کامیاب و بامراد کرنے اور قیامت تک ان کی رہنمائی کرتے رہنے کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔

قرآن نے عقلی دلائل، فطری براہین، نفسیاتی حقائق اور آثار کائنات کی روشنی میں اللہ کی بندگی اور آخرت کی کامیابی کو انسان کا مقصد وجود ہونا ثابت کیا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ اور سب سے پہلے خود اس پر عمل کیا اور دوسرے انسانوں کو دعوت دی کہ زندگی کے اس اہم ترین مسئلے پر غور کریں۔ انھوں نے کسی قومی یا وطنی اتحاد کا نعرہ بلند نہیں کیا اور نہ کسی طبقہ واری تنظیم کے لیے جدوجہد کی، آپ نے تمام دنیا کے انسانوں کے سامنے چند بنیادی اصول رکھے، دنیا کے دوسرے طریقوں اور دوسرے مقاصد کے مہلک ہونے کو واضح کیا اور اللہ کی بندگی اور آخرت کی کامیابی کو دلائل کی روشنی میں صحیح مقصدِ وجود بتایا، جن لوگوں کو اس مقصد کی صحت پر یقین آتا گیا اور جو اس مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بناتے گئے اور اسی کی خاطر آگے بڑھے صرف انھیں کو مسلم و مومن کہا گیا، انھیں کی تنظیم کی گئی اور انھیں سے اس مقصد کی سربلندی کے لیے کام لیا گیا اور یہی صحیح اور فطری طریقہ بھی تھا، قومی یا طبقہ واری اصولوں پر تنظیم کر لینے یا وقتی طور پر کچھ ظاہر فریب نعرے لگا کر بھیڑ اکٹھا کر لینے سے وقتی اور نمائشی کام تو ہو جاتا ہے لیکن مقصد کے صحیح علم کے فقدان اور یقین کی کمی تھوڑے ہی دنوں میں سارے کام کو خراب کر کے رکھ دیتی ہے اس کے لیے صحیح طریقہ یہی ہے کہ صرف ان لوگوں کو اکٹھا کیا جائے جو کسی صحیح مقصد پر ایمان و یقین رکھتے ہوں اور جنھوں نے اس یقین و اذعان سے مجبور ہو کر اپنے ماحول کے خلاف پیش قدمی کی ہو۔

صحیح طریق کار

جب کچھ لوگ ایک مقصد کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں تو یہ سوال خود بخود ابھر کر سامنے آتا ہے کہ اس مقصد کے حاصل کرنے کا طریق کار کیا ہو، ہم اس بحث سے فارغ ہو چکے ہیں کہ اللہ کی بندگی، اس کے قانون کی پیروی اور آخرت کی کامیابی نوعِ انسانی کا صحیح مقصد وجود ہے اور یہ بھی ہم جان چکے ہیں کہ اس کے لیے قرآن لوگوں میں کس طرح یقین و اذعان پیدا کرتا ہے، اب آئیے یہ دیکھیں کہ اس کے

لیے وہ طریق کار کیا اختیار کرتا ہے۔

قرآن انسان کے اندر یہ یقین پیدا کرنے کے بعد کہ اس کا مقصد وجود اللہ کی بندگی کرنا ہے اور آخرت کو کامیاب بنانا ہے اور یہ ثابت کرنے کے بعد کہ اللہ کی بندگی اس کے قانون کی پیروی سے ہوتی ہے، انسان کے سامنے ایک تدریج کے ساتھ اللہ کا وہ قانون رکھ دیتا ہے جس پر اسے عمل کرنا ہے اور اس سے مطالبہ کرتا ہے کہ اسے ایک ترتیب اور تدریج کے ساتھ اپنائے یہاں تک کہ اس کی پوری زندگی اپنے تمام شعبوں سمیت اللہ کی بندگی اور اس کی اطاعت میں آجائے، اسلام اس قانون پر عمل کرانے کے سلسلے میں ایمان ویقین کے علاوہ اپنے عبادتی، اخلاقی اور تربیتی پروگرام سے بھی کام لیتا ہے اور ان سب کے ذریعہ انسان کی ساری زندگی کو "عمل صالح" یعنی نیکیوں کا سرچشمہ بنا دیتا ہے۔

آپ اس طریقہ کار پر غور کریں گے تو آپ کو خود بخود یقین ہو جائے گا کہ اس مقصد کے لیے اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ کار ہو ہی نہیں سکتا جب اللہ کی بندگی اس کے قانون کی پیروی ہی ہو سکتی ہے اور آخرت کی کامیابی اسی پر منحصر ہے کہ اللہ کی بندگی کی جائے تو ظاہر ہے کہ اطاعتِ قانونِ الٰہی یا عمل صالح ہی اس مقصد کو حاصل کرنے کا واحد اور یقینی ذریعہ ہے اور اس کے علاوہ اس کے لیے اور کوئی طریقۂ کار موزوں نہیں ہو سکتا، پھر عمل و اطاعت پر آمادہ کرنے کے لیے یقین کو پیدا کرنے، مختلف تربیتی پروگراموں کے ذریعہ اسے زندہ و بیدار رکھنے اور عملی پروگراموں کے ذریعہ انسان کو عمل کا خوگر بنانے سے بہتر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے اور اسلام کے ایمانیات، عبادات، نظام تربیت و اخلاق کا مطالعہ کرنے کے بعد انسان اس نتیجہ پر آسانی کے ساتھ پہنچ سکتا ہے کہ اس کے لیے وہ بہترین محرکات اور بہترین پروگرام فراہم کرتے ہیں۔

عام طور پر انسانی تحریکوں کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ان کا

مقصد وطریقہ کار انسانوں کی پوری زندگی کو اپنے مخصوص رنگ میں نہیں رنگتا بلکہ الگ سے ایک ضمیمہ کے طور پر زندگی سے جڑ جاتا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یا تو زندگی کی وحدت مختلف محرکات اور مختلف پروگراموں میں تقسیم ہو کر برباد ہو جاتی ہے یا اصلی زندگی کا انسان پر غلبہ ہو جاتا ہے اور وہ اس ضمیمہ سے اپنا دامن چھڑانے لگتا ہے یا اسے اپنے مقاصد کے لیے آلۂ کار بنانے کی منافقانہ روش اختیار کر لیتا ہے۔

اسلام کا مقصد اور طریقۂ کار اس عیب سے پاک ہے۔ انسانی زندگی پوری کی پوری ان کے دائرے میں آجاتی ہے اور اسلام اللہ کے رنگ میں پورے انسان کو رنگ دیتا ہے، اس طرح ہر فرد اپنی پوری زندگی میں اور پوری "امت مسلمہ" اپنی اجتماعی زندگی میں اسی مقصد وطریقہ کار کی حامل بن جاتی ہے۔

دنیا میں غلط طریقہ ہائے کار سے فتنہ وفساد جنم لیتے ہیں لیکن پوری زندگی کو نیکیوں سے بھر پور کرنے کے بعد انسانیت کو کس فتنہ انگیزی کا ڈر ہو سکتا ہے اور کیا اس طریقہ کار سے بھی زیادہ کوئی صالح اور صحیح طریق کار ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے انسان نیکیوں کا سرچشمہ بن جائے۔

انسان کی زندگی کے دو جزو ہیں، انفرادی اور اجتماعی، انفرادی زندگی میں تو ایک انسان اپنے عزم و یقین کی بنا پر "عمل صالح" کی راہ اختیار کر سکتا ہے لیکن اجتماعی زندگی میں اس روش کو اس وقت تک اختیار نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ دوسرے انسان، انسان کا ماحول، ملکی و قومی اور عالمی و اجتماعی ادارے، اجتماعی زندگی کے تمام شعبے معیشت معاشرت، تعلیم اور سیاست سب کے سب اس رنگ میں رنگ نہ جائیں، اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے ارتقاء کی جدوجہد کے ساتھ نوع انسانی کے ارتقاء کی فکر بھی کرے اور جس مقصد وطریق کار کو اس نے اپنے لیے صحیح سمجھا ہے اسے قبول کرنے کی دوسروں کو بھی دعوت دے۔

اسی لیے قرآن نے ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کرنے والوں پر یہ اہم فریضہ بھی عائد کیا کہ دنیا کے دوسرے انسانوں کو بھی اس راہ کی طرف بلائیں جس پر وہ خود چل رہے ہیں، اس نے تاریخ اقوام وملل سے استشہاد کرتے ہوئے بتایا کہ قوموں کی تباہی وبربادی اور ان کے انحطاط کا بڑا سبب یہ تھا کہ نیک لوگوں نے انفرادی نیکیوں کو کافی سمجھ لیا اور برائیوں کا جو طوفان قوم وملک اور انسانیت کو تباہی کے عمیق سمندر میں پھینکنے کے لیے شدت کے ساتھ امڈا چلا آرہا تھا اس کی طرف سے انھوں نے آنکھیں بند کرلیں، نتیجہ یہ ہوا کہ عام انسانوں کے ساتھ یہ نیک لوگ بھی تباہی کا شکار ہوگئے اور ان کی انفرادی نیکی اجتماعی برائی کے اثرات کو دھو نہ سکی اس نے نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں یہ بتایا کہ امتِ "مسلمہ" کے نام سے جو جماعت وجود میں لائی گئی ہے اس کا اجتماعی مقصد ہے ہی یہی کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دے اور شہادت حق کی اہم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے ہر قوم کے ارتقاء کے لیے اور ہر تحریک کی کامیابی کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے کی جدوجہد کی جائے اور اس جدوجہد کو برابر جاری رکھا جائے لیکن اس معاملہ میں بھی اسلامی تحریک تمام غیر اسلامی تحریکوں سے ممتاز روش اختیار کرتی ہے، عام تحریکیں جھوٹے پروپیگنڈوں سے، فریب تحریر وتقریر سے، مکاری وعیاری سے، تشدد واکراہ سے، دھمکی اور لالچ سے اور حکومت کی طاقت اور دباؤ سے پھیلائی جاتی اور پھیلتی ہیں اور اس معاملے میں اگر مذاہب کی تاریخ انسانیت سوز مظالم سے پر ہے تو لادینی تحریکیں بھی ان سے پیچھے نہیں ہیں۔ لیکن اسلام چوں کہ عملِ صالح کا دوسرا نام ہے اس لیے وہ اس قسم کے ذرائع سے اپنے پیروؤں کو سختی کے ساتھ روکتا ہے اور نہایت وضاحت سے یہ بتاتا ہے کہ ان طریقوں کے اختیار کرنے سے یہ کام بننے کے بجائے اور بگڑ جاتا ہے، وہ بتاتا ہے کہ

اسلامی دعوت کا پہلا اصول یہ ہے کہ انسان اس دعوت کا خود عملی نمونہ بنے اور دوسرا اصول یہ ہے کہ حکمت وموعظت کے ساتھ دلائل وبراہین کی روشنی میں اپنی دعوت کو مخاطب کے سامنے پیش کرے اور اس بات کا پورا موقع دے کہ وہ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرلے، اگر کوئی مخالف کسی موضوع پر گفتگو کرنا چاہے تو نہایت عمدگی کے ساتھ گفتگو کرے، بحث اور نزاع سے بچے، جو کچھ کہے حسن اخلاق اور ملائمت کے ساتھ کہے اور اگر مخاطب گالیاں دینے اور جھگڑا کرنے پر بھی اتر آئے تو بھی اس کی ان حرکات کو برداشت کرے، اس سے درگذر کرے اور اپنی اخلاقی سطح کو ہرگز پست نہ کرے، اور دعوت قبول کرانے کے سلسلے میں کسی جبر واکراہ سے کام نہ لے کیوں کہ یہ خدا کے دین کی دعوت ہے اور اگر اس میں جبر واکراہ صحیح ہوتا تو خدا خود بندوں کو مجبور کرسکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام تلوار اٹھانے کی بھی اجازت دیتا ہے، لیکن ان لوگوں کے خلاف جو اسلامی دعوت کو بزور کچلنے کا فیصلہ کرچکے ہوں اور ان کو حسن عمل اور دلائل وبراہین کا پورا زور اس روش سے باز رکھنے میں ناکام رہا ہو، یا ان لوگوں کے خلاف جو اقتدار پاکر دنیا میں فتنہ وفساد کے ایجنٹ بن گئے ہوں۔ اور جنھوں نے طاقت کے زور سے اللہ کی زمین کو فساد سے بھر دیا ہو۔ ان لوگوں کے خلاف اسلام اس حد تک جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے کہ اسلامی دعوت کو معقولیت کے ساتھ پیش کرنے اور سمجھنے کے مواقع پیدا ہوسکیں، اور فتنہ وفساد طاقت سے مسلح ہوکر میدان میں آنے کے بجائے دلائل سے مسلح ہوکر آنے پر مجبور ہوجائے، پھر جنگ کی یہ اجازت بھی اتنی شرائط کے ساتھ اور اس قدر حدود کے اندر محدود کرکے دی گئی ہے کہ اس میں جبر واکراہ کا سرے سے کوئی پہلو باقی نہیں رہتا اور نہ فتنہ وفساد کے پھیلنے یا کسی قوم کے خلاف مخالفانہ جدوجہد کا کوئی اندیشہ پیدا ہوتا ہے، کیوں کہ جیسا کہ اسلامی قوانین جنگ کے تفصیلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے اسلامی جنگ فتنہ وفساد کی ہر شکل سے

اپنا دامن بچاتی ہے اور اس وقت میدان میں آتی ہے جب فتنہ و فساد کا غلبہ حد سے بڑھ جاتا ہے اور ان لوگوں کے ذریعے آتی ہے جو اپنی زندگی اخلاقی، فساد سے پاک کر چکے ہوتے ہیں، پھر جنگ مادّی اغراض و مقاصد یا قومی و طبقاتی مفادات کے لیے نہیں ہوتی بلکہ ان اصولوں کے دعوت کے لیے میدان ہموار کرنے کی خاطر ہوتی ہے جو پوری نوعِ انسانی کے ارتقاء کے لیے ضروری ہیں اور جو مادّی ہونے کے بجائے اخلاقی ہیں۔

صبر و استقامت، عروج و ارتقاء کے لیے ایک لازمی شرط ہے اور ہر قوم اور ہر تحریک کو اس دشوار گذار وادی سے گزرنا پڑتا ہے، لیکن غیر اسلامی مقاصد اور غیر اسلامی تحریکیں چوں کہ جزوی مسائل کی حامل ہوتی ہیں اور وقتی اور ہنگامی معاملات سے ان کا تعلق ہوتا ہے اس لیے ان کو اختیار کرنے والوں کی ثابت قدمی بہت سطحی قسم کی ہوتی ہے اور ان کے صبر کا پیمانہ بہت جلد لبریز ہو جاتا ہے اس کے برخلاف اسلام کا تعلق چونکہ زندگی کے تمام شعبوں سے ہے اور اس کا تعلق انسان سے تھوڑی دیر کے لیے نہیں بلکہ عمر بھر کے لیے ہوتا ہے اس لیے جو استقامت اس کے ذریعہ انسان میں پیدا ہوتی ہے وہ کسی اور طریقہ سے پیدا نہیں ہوتی، اسلام سب سے پہلے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ انسان اپنے دل و دماغ سے تمام غیر اسلامی نظریات کو نکال دے اور زمانے کے نظریات خواہ کچھ ہوں ان کی پروا نہ کرتے ہوئے بلکہ ان کا مقابلہ کرتے ہوئے صحیح اسلامی حقائق کو اپنے دل و دماغ میں پیوست کرے پھر وہ انسان کو اس بات کے لیے آمادہ کرتا ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کام اور ہر معمولی اور غیر معمولی بات میں وہ اللہ کی بندگی اختیار کرے اور اس کے قانون کی پیروی کو پوری احتیاط کے ساتھ ملحوظ رکھے، اس کے لیے انسانوں کو اپنے نفس کی خواہشات کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے، اپنے دنیوی مفادات کے لہلہاتے باغ سے بھی ہاتھ دھونا ہوتا ہے، اپنے

خاندان، اپنے ماحول، اپنی غلط کار حکومت، اور اپنے زمانے، غرض ہر چیز سے چومکھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے اور ان سب میں اسے ثابت قدم رہنا ہوتا ہے پھر اسے غلط کار زمانے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنی ہوتی ہے اور مسلسل دعوت دینی ہوتی ہے پھر اگر کوئی بھی اس کی بات سن کر نہیں دیتا تو بھی اسے حق سے عمر بھر چمٹا رہنا پڑتا ہے اور اقتدار حاصل ہو جائے تو بھی وہ آزاد نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذمہ داریاں اور بڑھ جاتی ہیں اور اسے دنیوی جاہ حشمت کی آلائشوں اور انسانی حکمرانی کی ہوسناکیوں سے اپنے دامنِ تقویٰ کو پوری ہوشیاری کے ساتھ بچانے کی ضرورت پڑتی ہے اور اسی کشمکش میں اس کی ساری عمر بیت جاتی ہے۔

صبر و استقامت کی یہ ہمہ گیری آپ کو اسلام کے سوا کہیں نہیں ملے گی، اور اللہ کی صفات پر یقین، اس کی امداد و نصرت پر بھروسہ، اللہ کے حاضر و ناظر اور علیم و خبیر ہونے کا تصور، عذابِ آخرت کا خوف، اور دنیا کے جھوٹے معمولی اور کبھی ملنے اور کبھی نہ ملنے والے فوائد کے بجائے آخرت کے حقیقی، غیر معمولی اور یقینی منافع اور ابدی کامیابی کا یقین، اسلام کا ہمہ گیر قانون اور اس کا بے مثال نظام تربیت وہ چیزیں ہیں جو انسان کے اندر یہ صبر و استقامت پیدا کرتی ہیں اور جس قوم کے اندر یہ صبر پیدا ہو جائے اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ پھر ایمان و عمل صالح اور دعوت و تبلیغ اور صبر و استقامت کے لیے ضرورت ہے کہ اہل ایمان کی زندگی اجتماعی ہو، وہ ایک نظم میں منسلک ہوں، وہ ایک امیر کی اطاعت کرتے ہوں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کتاب و سنت میں اہل ایمان کے لیے اجتماعی زندگی کو لازم قرار دیا گیا ہے اور انتشار کو جاہلیت کی زندگی اور اس عالم میں مر جانے کو جاہلیت کی موت سے تعبیر کیا گیا ہے، اہل ایمان کی جمعیت کو انتشار میں تبدیل

کرنے کی کوشش کرنے والوں کے لیے دنیا و آخرت میں سخت ترین سزائیں تجویز کی گئی ہیں اور اہل ایمان کے لیے اپنی امیر کی اطاعت کو ایمان کا لازمی تقاضا بتایا گیا ہے، ان کو اپنے اندر سے ان تمام بداخلاقیوں کے دور کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جن سے اہل ایمان کی اجتماعیت کو معمولی سا خطرہ بھی لاحق ہو سکتا ہو، اور ان مکارم اخلاق کے پیدا کرنے کی انھیں تاکید و تلقین کی گئی ہے جن کے پیدا کرنے کے بعد وہ قرآن پاک کے الفاظ میں "بنیان مرصوص" (سیسہ پلائی ہوئی عمارت) اور حدیث کے الفاظ میں "جسدِ واحد" (ایک جسم) بن سکیں۔

یوں تو پورا قرآن پاک اسی پروگرام کی وضاحت اور اسی مقصد و طریقۂ کار کی وضاحت پر مشتمل ہے لیکن سورۂ والعصر میں اس حقیقت کو بہت مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَالْعَصْرِ ۝١ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝٢	زمانہ (گذرا ہوا یا گزرتا ہوا) شاہد ہے کہ نوعِ انسانی یقیناً خسارے
اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	میں ہے مگر وہ لوگ جو (اللہ کی بندگی، اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کی
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝٣	رسالت، اسکے قانون اور آخرت پر) یقین لائے جنھوں نے عملِ
(والعصر)	صالح کی روش اختیار کی جنھوں نے ایکدوسرے کو صبر و استقامت کی تاکید کی۔

یہ ہے وہ پروگرام جو نوعِ انسانی کے دنیاوی اور آخروی عروج و ارتقاء کا واحد یقینی پروگرام ہے، مسلمان جب اس پروگرام کو لے کر اٹھے تھے انھیں بے مثال عروج نصیب ہوا تھا اور جتنا وہ اس سے غیر متعلق اور بے پروا ہوتے گئے اتنا ہی وہ انحطاط کا شکار ہوتے گئے یہاں تک کہ آج ان کا حال یہ ہے کہ ان کی بہت بڑی اکثریت اسلام کے علم سے بے بہرہ اور اس کے یقین سے محروم ہے اور عمل صالح اور دعوتِ حق اور صبر و استقامت کا تو ذکر ہی کیا ہے، اسکا نتیجہ ان کی وہ حالت ہے جس سے ہم سب واقف ہی نہیں دوچار ہیں، اب اگر مسلمانوں کو اس ورطۂ ہلاکت سے نکالنا ہے اور غیر مسلم اقوامِ عالم کو کوئی پیغام فلاح و بہبود دینا ہے تو اس کے لیے مادی مقاصد اور مادی پروگرام بالکل غلط ہیں، دنیا کو ان سے کڑوے اور کسیلے پھلوں کے سوا کچھ نہیں ملا ہے، اسکے لیے صرف ایک ہی پروگرام صحیح ہے اور وہ ہے ایمان، عملِ صالح، دعوتِ حق، اور صبر و استقامت کا پروگرام، جسے اسلام نے پیش کیا ہے۔